نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی

ماہنامہ

رفیقِ منزل

جلد: ۳۱ | شمارہ:۳ | مارچ ۲۰۱۸ء | ربیع الآخر- جمادی الاول ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-india.org

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-india.org

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic O rganisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor: Mustajab Khatir**

نبیؐ کیسے تھے، کیا تھے اور کیا نہ تھے؟

ڈاکٹر وقار انور

عن ابی هریرہ کان ﷺ شبح الذراعین اهدب اشفار العینین بعید ما بین المنکبین یقبل جمیعا و ید بر جمیعا لمه یکن فاحشا ولا متفحشا ولا صخابا فی الاسواق (السلسلة الصحیحه حدیث نمبر 2184)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ کی کلائیاں چوڑی تھیں اور آنکھوں کے کشادہ کناروں والے تھے، کاندھوں کے درمیان فاصلہ تھا، پوری توجہ سے آگے چل کر آتے اور پوری توجہ سے واپس جاتے، بدگو، بدزبان اور بازاروں میں شور کرنے والے نہ تھے۔

درج بالا حدیث شمائل نبیؐ سے متعلق ہے۔ اس طرح کی روایات میں اصحاب کرام رضی اللہ عنھم حضورؐ کی شکل وصورت، عادات واطوار، ذوق و مزاج اور سیرت وکردار کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں۔ الفاظ اصحاب کرام کے ہوتے ہیں اور بیان آقائے نامدار کا ہوتا ہے۔ آں حضرتؐ پر ایمان لانے والوں نے کس محبت، تعلق اور توجہ سے آپؐ کی ایک ایک ادا اور ایک ایک خصوصیات کا مشاہدہ کیا، یاد رکھا اور ان کی روایت کی ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک عجوبہ اور حسین باب ہے۔ اس طرح نبیؐ کی پوری قلمی تصویر محفوظ ہوگئی ہے اور آپ کی شخصیت کے تمام پہلو صفحہ قرطاس پر موجود ہیں۔ ایسا نہ اس سے قبل کسی اور شخصیت کے سلسلہ میں ہوا اور نہ بعد میں اور نہ قیامت تک ہونے کا کوئی امکان ہے۔

شمائل نبیؐ کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو قاری کے اندر محبت رسول، جو دراصل ایمان وعمل صالح کا لازمی تقاضہ ہے، کی لو کو بڑھانے والا ہے۔ یہ لو جتنی تیز ہوگی ایمان کا نور اتنا ہی زیادہ منور ہوگا اور قرب الٰہی اس شخص میں اتنا ہی زیادہ بڑھتا چلا جائے گا۔

متذکرہ حدیث میں حضورؐ کی کلائیوں، آنکھیں اور کاندھوں کے سلسلہ میں جو ذکر ہے اس کا ذکر آپؐ سے ذاتی تعلق کو بڑھانے والا ہے۔ ذات رسول سے یہ ذاتی تعلق محبت رسول کی ایسی کیفیت پیدا کر سکتا ہے جس کے بعد اطاعت رسول سہل ہو جائے۔ ظاہری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو جو حسن و جمال عطا کیا تھا اسے کوئی دوسرا شخص اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا لیکن اس کا گرویدہ ہو کر اطاعت اور اتباع رسول کی راہ میں آگے کا سفر طے کرنے کی سعی کر سکتا ہے۔

اس حدیث میں بقیہ باتیں ایسی بیان ہوئی ہیں جن کا اتباع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ راوی نے حضورؐ کی یہ صفت بیان کی ہے کہ آپؐ پوری توجہ سے آگے چل کر آتے تھے اور پوری توجہ سے واپس جاتے تھے (یقبل جمیعا و ید بر جمیعا)۔ اس کا ترجمہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ سامنے ہوتے تو مکمل اور پیچھے مڑتے تو مکمل۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی دوسری روایت یہ ہے ''میں نے کسی کو رسول اللہؐ بڑھ کر تیز رفتار نہیں دیکھا ہے، گویا زمین آپؐ کے لیے لپیٹ دی جاتی تھی۔'' دوسری روایتوں سے جو بات معلوم ہوتی ہے کہ قدم رکھتے تو پورا قدم رکھتے، جھٹکے سے اٹھتے پھر جھٹکے سے پاؤں اٹھاتے اور نرمی سے چلتے اور جب مڑتے تو پورے مڑتے۔ کسی سے گفتگو کر رہے ہوتے تو صرف چہرہ اس کی طرف نہیں کرتے بلکہ پورا جسم اس کی طرف کر لیتے۔ ان تمام باتوں سے جو صفات سامنے آتی ہیں کہ وہ یہ ہیں کہ آپؐ جو کام کرتے پوری توجہ، پوری دلجمعی اور مکمل طور پر کرتے، آتے تو پورے طور پر آتے، جاتے تو پورے طور پر جاتے اور مڑتے تو پورے طور پر مڑتے اور کسی سے گفتگو کرتے تو پوری سنجیدگی کے ساتھ اور یہ صفات زندگی کے تمام معاملات پر محیط ہیں۔ ہمارے لیے بھی اسوہ رسول یہی ہے کہ کوئی کام بے دلی اور ڈھیلے ڈھالے طریقہ پر انجام نہیں دیا جائے۔ زندگی کا ہر کام کو حتی کہ نشست و برخواست جیسے بظاہر عمومی اور معمولی کام بھی پوری سنجیدگی اور دل وجان کی آمادگی کے ساتھ کیا جائے۔

راوی حدیث نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ حضورؐ کیسے تھے، اخیر میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپ کیا نہ تھے، یعنی کن خرابیوں کا شائبہ تک بھی آپ کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے۔ راوی بتاتے ہیں کہ رسول اللہ بدگو، بدزبان اور بازاروں میں شور کرنے والے نہ تھے۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جو عام انسانوں میں اکثر پائی جاتی ہیں لیکن آپؐ ان سے پاک تھے اس لیے امت کے افراد کو بھی اسوہ رسول کے اتباع میں ان خرابیوں سے بچنا چاہیے۔

متذکرہ حدیث کا حسن یہ ہے کہ اس کے شروع میں آں حضرتؐ کے ظاہری حسن کا بیان ہے اور بعد میں حسن باطنی کا جس کے پرتو کے طور پر آپؐ کا بنیادی کردار کیا تھا اور کیا نہ تھا اس کا ذکر آ گیا ہے۔ محبت، اطاعت اور اتباع رسول کا وافر سامان اس روایت میں موجود ہے۔

سائنسی تحقیقات: خدمت دین کا اہم محاذ

علماء، نیتا اور تاجروں کے علاوہ بالعموم ملت اسلامیہ میں کسی اور پیشہ وصلاحیت کے افراد کی قدر دانی کم ہی نظر آتی ہے۔ بڑی آسانی سے سائنسدانوں اور سماجی علوم کے ماہرین کو نظر انداز کرنے کا رویہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ اس صورتحال نے ایک ایسی نسل کو تیار کیا ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ دین کی خدمت اور سماج میں شرف وعزت کے لئے ان پیشوں سے ہٹ کر کوئی اور مواقع موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح ان کے دل میں سائنسی تحقیقی مزاج اور چھان پھٹک کے رویہ میں زبردست کمی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس وہ قومیں جو نظریات کا تجزیہ کرنے اور تنقیح وتنقید کے ذریعے حقائق تک پہنچنے کا مزاج رکھتی ہیں ان کی اجتماعی زندگی میں بھی اور انفرادی زندگی میں بھی سائنسدانوں اور مختلف علوم کے ماہرین کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔

فی زمانہ مذاہب کے ظلم وجور کے ختم ہونے کا اور الحاد کی ستم آرائیوں کا زمانہ ہے۔ انسانوں کو اپنے حسیات اور استعداد کی کمتری قبول نہیں ہے۔ کائنات کی تفہیم اور تصویر، بغیر خدا کے مشکل متصور نہیں کی جارہی ہے۔ ایسے میں اسلامی "نظریہ" کو بھی جانچا اور پرکھا جائے گا۔ یہ دیکھا جائے گا کہ الحاد کے بالمقابل زیادہ مضبوط بنیادوں پر اسلام تشکیل پاتا ہے یا نہیں۔ کائنات اور اس کے جملہ حیوانات کے بارے میں قابل گرفت جوابات اسلام دے سکتا ہے یا نہیں؟ نئے پیش آمادہ مسائل کا کوئی حل اسلام کے دامنِ جلو میں ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنا سماجی نشاط الثانیہ اور اسلام کی دعوت کے لئے ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے ان سوالات کے جوابات روایتی علماء، نیتا اور تاجروں کے یہاں ملنے سے رہے۔ اسی لئے مسلم طلبہ ونوجوانوں کو اس بے حد قیمتی محاذ کو سنبھالنا ہوگا۔

مصنوعی ذہانت نے انسانوں کے شعور، سماجی روابط، خدمت اور رشتے، فیصلہ سازی اور شخصی آزادی، سیاست وسیادت کے بے شمار پہلوؤں پر سوالات کھڑے کر دئے ہیں۔ ان حالات میں صحیح اجتہاد اسی کے بس کی بات ہے جو کمپیوٹر کی ان اعلیٰ درجہ کی معلومات کا ادراک رکھتا ہو۔ اسی طرح اطلاقی سائنس نے جن اخلاقی مسائل کو پیدا کیا ہے، اس پر گرفت کرنا اور انسانی شعور کی پرداخت کرنا کسی سائنسداں ہی کے بس کی بات ہے۔ دوسری طرف انسانوں کی تکالیف کا ازالہ، آسودگیوں کا اضافہ، تحقیق اور غور وفکر کی نئی جہات کو پیش کرنے کا کام اس وقت اعلیٰ درجہ کے سائنسدانوں ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسان کی پہنچ اور اس کی بے بضاعتی اور اس کے مخلوق اور مجبور ہونے کا شعور دلانا سائنسی تحقیق ہی سے ممکن ہے۔ گویا ہماری ترقی اور دین کی خدمت کا راستہ لازماً سائنسی تحقیقات سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی پوری قوم کو ایک بڑا طبقہ ماہرین علوم کا پیدا کرنے کی جانب متوجہ ہونا پڑے گا۔

ہندوستان میں بالعموم اعلیٰ تعلیم کی صورتحال بڑی خراب ہے۔ اور اس پہ ستم یہ کہ مسلمانوں کو پیسہ کمانے کے لئے پیشہ وارانہ کورسیس کے علاوہ کسی اور چیز کی دھن نہیں لگی ہے۔ ان دونوں عوامل نے مل کر اس بات کو عملاً ناممکن بنا دیا ہے کہ پوری قوم کو اس جانب فوری متوجہ کیا جائے۔ اسی لئے کم از کم ایس آئی او کے نوجوانوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جہاں وہ خود میں اتنی قوت پیدا کریں گے وہیں امت کے ذہین اور محنت کش طلبہ کو جمع کر کے انہیں خوب سے خوب تر ماہرین سائنس بنانے کی جانب کوشاں رہیں گے۔

معاشی عدم مساوات اور نظام معیشت

بے دینی پر مبنی نظام معیشت سے اور امید بھی کیا کی جاسکتی ہے۔ ظلم، ناانصافی اور معاشی بدحالی کے علاوہ کیا اس کے کچھ اور نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ نہیں، بالکل نہیں۔ خالق کی ہدایات تو روز اول سے یہی سمجھا رہی ہے۔ مخلوق کے اپنے مشاہدات بھی وقتاً فوقتاً اسے اشارے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن اہل علم کی بے علمی اور اہل عقل کی بے عقلی تعجب خیز ہے۔ ویسے دین سے بیزاری کے نتائج پر غور کرنے کے بعد یہ حیرت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

آکسفیم کی جانب سے جاری کردہ حالیہ رپورٹ فی الحقیقت دنیا کو موجودہ نظام معیشت پر بالعموم اور موجودہ نظام زندگی پر بالخصوص غور کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ جنوری میں شائع کردہ رپورٹ میں یہ بات کہی گئی کہ گذشتہ سال دنیا کی کل آبادی کے صرف ایک فیصد حصے پر مشتمل امیر افراد، دولت کی مجموعی پیداوار کے ۸۲ فیصد حصے کے مالک بنے جب کہ ۵۰ فیصد غریب عوام اس پیداوار کے کسی بھی قسم کے فوائد سے محروم رہے۔ پچھلے بارہ مہینوں میں ارب پتیوں کی دولت میں ۷۶۲ بلین کا اضافہ ہوا

جس سے موجودہ دنیا کی غربت کو ۷ دفعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ ۲۰۰۶ سے ۲۰۱۵ کے دوران عام ملازم کی آمدنی میں سالانہ دو فیصدی کی شرح سے اضافہ ہوا جبکہ ارب پتیوں کی دولت میں اضافے کی شرح ۱۳ فیصد رہی، یعنی اول الذکر سے تقریباً ۶ گنا سے زائد۔ رپورٹ اس طرح کے کئی اعداد و شمار کو پیش کرتی ہے۔ ۱۰ ممالک کے کل ۷۰ ہزار لوگوں پر کئے گئے سروے پر مبنی یہ رپورٹ مزدوروں بالخصوص خواتین ملازمین کی خستہ حالی اور بے کسی کو بھی نمایاں طور پر بیان کرتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں مستقبل کے متعلق کئی اندیشے بھی بیان کئے گئے جیسے یہ بات کہی گئی کہ اگر یہی صورتحال رہی تو اگلے ۲۰ سالوں میں دنیا کے ۵۰۰ امیر ترین لوگوں کے پاس ہندوستان جیسے ملک کی مکمل جی ڈی پی کے مساوی دولت جمع ہوجائے گی وغیرہ۔

معاشی عدم مساوات، غربت، محنت کش طبقے کی حالت زار وغیرہ کو ظاہر کرنے والی اس طرح کی کئی رپورٹیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان پر تبصرے اور تدارک کے لئے ممکنہ لائحہ عمل پر غور بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سوال اہم علم اور اہل دانش کی کم علمی یا نامعقولیت پر ہے جو ہمیشہ نبض مسئلہ کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ انہیں ہمیشہ جزئیات پر بحث کرنے میں دلچسپی رہی اور اسے ہی انہوں نے مکمل اور متبادل حل سمجھ لیا۔ نتیجہ دن بدن بگڑتی معیشت کی صورت میں ظاہر ہے۔ نظام معیشت اور اس کی بنیادوں پر بات کرنے اور اسے مکمل نظام زندگی سے مربوط کرتے ہوئے سوچنے کے بجائے صرف حاصلات اور نتائج پر بات کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی درخت سے مطلوبہ پھل نہ ملنے کی صورت میں بیج کو تبدیل کرنے کی بجائے تنے اور شاخوں کو کاٹا جائے اور اسی بیج سے نئے پھلوں کی توقع کی جائے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل علم گہرے تدبر کے ساتھ مکمل نظام معیشت کا جائزہ لیتے، غور کرتے، متبادل نظام کے بارے میں سوچتے جس سے کہ وہ درست نتیجے تک پہنچ پاتے لیکن ان کی عقل وحی الٰہی کی ناگزیر روشنی سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے انہیں درست نہج پر سوچنے کی اجازت نہیں دیتی اور محدودیت کے دائرے میں بھٹکائے رکھتی ہے۔

سوال امت مسلمہ کی بے حسی پر بھی ہے۔ رحمت پر مبنی نظام زندگی سے امت بذات خود غافل ہے، کجا کہ وہ اسے دنیا کے سامنے پیش کرسکے۔ موجودہ نظام معیشت کی خرابیوں کا گہرائی سے جایزہ لینا اور الحاد کے شجر خبیثہ سے اس کے تعلق کو واضح کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے بلکہ زبردست اسٹڈی اور غور وخوص غرض علمی مجاہدہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ دین حق کے بغیر عالم انسانیت کی اور دعوت دین کے بغیر امت مسلمہ کی فلاح کسی صورت ممکن نہیں۔

مستقبل ہمارا ہے۔۔۔

''جذبات'' بندوں کو خالق کی جانب سے عطا کی گئی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت اور زبردست طاقت ہے۔ جذبات کئی مرتبہ انسان سے اس کی استعداد سے بڑھ کر غیر معمولی کام کروا لیتے ہیں، جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جذباتی کیفیت میں انسان کیا کچھ کرلے گا اس کا اندازہ کسی کو ہو نہیں پاتا، بذات خود اس فرد کو بھی نہیں۔ حتیٰ کہ کسی کی جان لینے یا اپنی جان کی قربانی دینے جیسے زندگی کے بڑے فیصلے بھی جذبات کی زد میں آکر معمولی بن جاتے ہیں۔ دیگر کئی حدود اور کمزوریوں کے باوجود جذبات کی اہمیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا۔

فروری میں منعقدہ کل ہند کانفرنس کے ذریعے ایس آئی او آف انڈیا کی مرکزی قیادت نے اپنے کیڈر کو ''عزت نفس کی بازیافت، مستقبل کی تعمیر'' کا حوصلہ افزا پیغام دیا۔ افتتاح سے لے کر اختتام تک جذبات کی گرمی تمام سیشن پر حاوی رہی۔ ۳۲ سالوں میں پہلی مرتبہ سارے ملک کے کیڈر کے اجتماع سے افراد مستفید بھی ہوئے اور محظوظ بھی۔ مقررین کی جانب سے مستقل کہی جانے والی یہ بات کہ ''مستقبل آپ کا ہے'' ہر مرتبہ دلوں میں نئی توانائی پیدا کررہی تھی۔ کانفرنس میں عملاً اس بات کا احساس ہوا کہ آپ ملک گیر طلبا تنظیم کا حصہ ہیں۔ نعروں کی گونج، ترانوں کی تاثیر، تقریروں کے زور اور مجموعی طور پر بننے والے ایک خاص ماحول نے کیڈر کے جذبات کا بلندی عطا کی۔ ملکی سطح پر تمام کیڈر کو جمع کرنا ایک اچھی پریکٹس ہے۔ اس کے کئی فوائد ہیں جو کانفرنس کے ذریعے محسوس کئے گئے ہیں۔ یقینا کچھ کمزوریاں بھی رہیں جن پر مرکزی قیادت کو کھلے ذہن کے ساتھ سوچنا چاہیے۔ ایک تاریخی کانفرنس کے انعقاد کے لئے ایس آئی او کی مرکزی قیادت مبارکباد اور دعاوں کی مستحق ہے۔ ذمہ داران کی مخلصانہ کوششوں اور مستقل کئی گئی محنت کے نتیجے میں ہی کانفرنس کا کامیابی کے ساتھ انعقاد ممکن ہو پایا۔

ایس آئی او سے تحریک اسلامی کو بڑی امیدیں ہیں۔ یہ امیدیں نہ ہی بے جا ہیں اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ۔ بلکہ سو فیصد حق بجانب ہیں۔ ان میدوں کو صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اپنی حیثیت اور شناخت کا صحیح اندازہ کرنا وہ عمل ہے جو کئی الجھنوں کو مٹا دیتا اور بے شمار پیچیدگیوں کو ختم کردیتا ہے۔ اپنی فکر، مقصد اور طریقہ کار کا صحیح فہم نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ ہم انتہا درجہ کی سادہ لوحی کے ساتھ تنظیم کی بربادی کے سبب بن جائیں۔ امیر جماعت نے جس ''دینی شناخت'' کی بات کہی اس پر مزید غور وخوص کی ضرورت ہے۔ بے شمار کام ابھی باقی ہیں، کئی منزلیں سر کرنی ہیں۔ یہ تمام کام اور منزلیں ہر چھوٹی اور غیر اہم باتوں سے بچنے اور ترجیحات کے درست تعین کا تقاضا کرتی ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ممکن عزت نفس کی بازیافت اور مستقبل کی تعمیر ممکن ہے۔

قارئین اپنے تاثرات، مشورے اور تجاویز ارسال کریں۔

رفیق منزل ایک ''دینی رفیق''

آج کے اس دور میں جبکہ بیشتر رسائل وجرائد اپنے قیام کا مقصد کھوتے ہوئے نظر آتے ہیں رفیق منزل، اسلامی خطوط پر اپنے مستقبل کو سنوارنے کا شوق رکھنے والے طلبہ کے لیے شب دیجور میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ فی الحقیقت رفیق منزل نئی نسل کا ایک ایسا معمار ہے اور تعمیر وترقی کا ایک ایسا داعی ہے جو اپنے رفقاء کی ہمہ جہت رہنمائی کرتا ہے۔ ماہ جنوری کا شمارہ نظر نواز ہوا تمام کالمز بے حد پسند آئے، لیکن برادرم ابوالاعلی سبحانی کا مضمون ''مثالی ازدواجی زندگی کا خاکہ'' برمحل اور وقت کے تقاضوں کے مطابق لگا۔ آج جبکہ پوری امت طلاق کی لعنت کا شکار ہے فسطائی طاقتیں اسلام کے نظام طلاق کو ختم کردینا چاہتی ہیں اور اسلام کے عائلی نظام پر مسلسل شکوک وشبہات وارد کیے جارہے ہیں۔ ایسے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خالص اسلامی تعلیمات کو ان کی اصلی شکل میں پیش کیا جائے تاکہ ان مثالی نقوش پر چل کر لوگ ایسے مواقع آنے ہی نہ دیں۔

حماد الرحمن بن عبدالرافع، جامعہ ملیہ اسلامیہ

ماہ فروری کا رفیق منزل ملا، جس کا مطالعہ واقعی قابل ذکر ثابت ہوا ہے۔ شروعات میں حدیث مبارک کا تذکرہ اور تشریح جس احسن انداز میں بیان ہوئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اسی طرح فہرست میں مختلف موضوعات کی شمولیت اور خودکشی جیسے عنوان پر سیاسی نقطۂ نظر کے بجائے اصولی نقطۂ نظر سے کی گئی گفتگو دل میں عجیب سی چھاپ چھوڑنے پر قادر ہے۔ خودکشی اس موضوع پر صرف نظریات کا ہی نہیں بلکہ ان سے جڑے شماریات پر غور کریں تو دل مایوس ہونے لگتا ہے کہ آجکل خصوصاً طلبا میں خودکشی کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ شمارے میں خصوصاً اس موضوع پر اسلامی نظریات کی روشنی بڑے ہی انوکھے انداز میں بتائی گئی ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر قارئین جانیں گے کہ خودکشی بزدلی کا نام ہے جو اللہ تعالی سے بغاوت اور اس کی عطا کردہ نعمت کے ساتھ خیانت کرنے کے مماثل ہے۔ آجکل پروفیشنل کورسس کے فارغین اور جاب کرنے والے افراد میں مختلف وجوہات کی بنا پر ڈپریشن اور مایوسی محسوس کی جاسکتی ہے، رفیق منزل کا مطالعہ ایک بڑی تعداد کو اسلامی طرز فکر کا آب حیات دے سکتا ہے۔ رسالہ میں اس موضوع کو پوری ریسرچ کے آئینے میں بالکل کھلے انداز میں پیش کیا گیا ہے جو واقعی قابل تعریف ہے۔ میری رائے میں اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ رفیق منزل کے مطالعہ سے قارئین میں اس سے رفاقت کے احساسات پیدا نہ ہوں یہ ممکن نہیں۔ اللہ اس رسالہ کو نوجوانوں کیلئے رہنما بنائے اور آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے۔

یاسر رحمٰن، لاتور

اللہ کا شکر ہے کہ آخر کار جنوری کا شمارہ مل ہی گیا! جنوری کا شمارہ ''طلبائی یونین ایک تجزیہ'' پر مشتمل تھا۔ شمارہ سرورق سے لے کر اخیر تک واقعی اپنی خوبصورتی میں یکتا ہے۔ میں ادارہ کو اس خوش آئند پہلو پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ رفیق کا یہ حسن دیکھ کر فوری طور پر یہ شوق پیدا ہوا کہ شمارہ کا مطالعہ کیا جائے۔ پہلی ہی نظر میں اداریہ بعنوان ''طلبائی یونین: تحفظ جمہوریت یا دین کی دعوت''؟ پر نگاہ پڑی۔ مطالعہ کرنے کے بعد لگا کہ مدیر محترم کی باتیں گنجلک اور پیچیدہ ہیں۔ رفیق منزل کے قارئین کی بڑی تعداد اس قسم کی پیچیدہ تحریروں سے استفادہ نہیں کرسکتی لہذا یہ باور کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسی زبان استعمال کی جائے جو آسان اور قابل فہم ہو۔ تحریر اس قدر ''بلیغ'' نہ ہو کہ مدعا سمجھ میں نہ آئے۔ یہ سوال اداریے میں حل نہ ہوسکا کہ طلبہ یونین سرے سے ہی مفید نہیں یا پھر یہ کہ طلبہ یونین کے ذمہ داران فی الحال نااہل اور ناعاقبت اندیش ہیں؟ یہ دونوں دو الگ الگ سوالات ہیں۔ میرے خیال سے کسی بھی چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اسی لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں سوالوں کے درمیان تمیز باقی رکھی جائے تاکہ قاری بآسانی صحیح سمت میں پروان چڑھ سکے۔ اور میری ذاتی رائے میں اداریہ کسی ایک ہی پہلو کی طرف صاف جھکا ہوا نہ محسوس ہو۔ اسی طرح کسی بھی طلبہ یونین کو آپ تعلیمی معیار کی بلندی کے لئے، اخلاقی ارتقاء کے لئے، سماج کی خدمت کے لئے، نظم وضبط کی تربیت کے لئے، شخصیت کے مجموعی ارتقاء کے لئے کوئی جدوجہد کرتے نہیں دیکھیں گے۔ اس جملہ کو پڑھنے کے بعد ایک ابہام یہ پیدا ہوا کہ کیا ہم کسی نظام کی تردید محض اس بنا پر کرسکتے ہیں کہ اس کی گورننگ باڈی اصلاحی انداز میں اپنے فرائض انجام نہیں دے رہی ہے۔ میرے خیال سے ان دونوں اشیاء میں فرق ملحوظ رکھنا زیادہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ ایس آئی او آف انڈیا روز اول سے کیمپس کے اندر جمہوری فضا ہموار کرنے کی جدوجہد کرتی رہی ہے، ایسے میں کیا یہ اداریہ تنظیم کو اس معاملے میں کسی نئی پالیسی کی طرف لے جانا چاہتا ہے؟

عبدالرحمن سرور جامعہ ملیہ اسلامیہ

مسلمان اور سائنسی تحقیقات

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز سے ایک گفتگو

ڈاکٹر اسلم پرویز کا نام علمی دنیا میں ایک معروف نام ہے۔ آپ کا تعلق دہلی سے ہے۔ نباتیات میں آپ نے M.Sc کی تعلیم حاصل کی اور تحقیقی میدان سے منسلک ہوئے پھر CSIR (Council of Scientific & Industrial Research) کے تحت پوسٹ ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔ کئی تعلیمی اداروں کے ذمہ دار کی حیثیت سے آپ نے خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے ۱۹۹۴ء میں اردو زبان میں ''ماہنامہ سائنس'' جاری کیا، جس کے تاحال مدیر ہیں۔ اردو داں طبقہ میں سائنسی علوم کی اشاعت آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ اسی طرح قرانی فکر کو سائنسی پیرائے میں سمجھنے کے حوالے سے آپ کی بے مثال کوششیں ہیں۔ آپ کے سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں، نیز قومی اور عالمی سطح کی متعدد کانفرنسوں میں آپ اپنے مقالات پیش کر چکے ہیں۔ ہارورڈ اور Yale جیسی یونیورسٹیوں میں آپ کے لیکچر منعقد ہوئے ہیں۔ فی الحال آپ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔

سوال: موجودہ دور میں الحاد اور مذہب بیزاری لوگوں بالخصوص نوجوانوں میں ایک فیشن کی سی شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ کیا سائنس حق شناسی کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ کیا اسلام کی ترویج واشاعت میں، انسان کے وجود سے متعلق اہم سوالات کے جوابات دینے کی غرض سے سائنس ایک وسیلہ بن سکتا ہے؟

جواب: چونکہ آپ نے مذہب بیزاری کا تذکرہ کیا، تو میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہوں گا۔ کچھ سالوں قبل داخلہ کے وقت ایک طالب علم نے فارم میں مذہب کے خانہ پر کوئی نشان نہیں لگایا، اور میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ کسی مذہب پر یقین نہیں کرتا۔ جس کی وجہ یہ بتائی کہ مذہب لوگوں کے مابین نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اور جہاں تک اس کی بات کا تعلق مذہب اسلام سے ہے تو اس میں سراسر مسلمانوں کا قصور ہے۔ اسلام نہ کبھی ایک مذہب تھا اور نہ ہے، بدقسمتی سے مسلمانوں نے مذہب کی مروجہ تعریف کے مطابق اسلام کو بھی اسی خانے میں ڈال رکھا ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں کہ بندگی کے وسیع مفہوم کو مسلمانوں نے محض رسوم عبادت جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ تک محدود کر دیا ہے۔ جبکہ اللہ کا ہر حکم چاہے وہ ذات، معاشرت، اخلاق یا کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو بندگی میں شامل ہے۔ مگر مسلمان اس کے بجائے محض رسوم کی پرواہ کرتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم اسلام کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں تو لوگوں کے لئے اس میں کوئی اپیل نہیں رہ جاتی۔ مثلاً ایک عام غیر مسلم گنگا اشنان کے ذریعے پاپوں کا پراشچت اور حج کے ذریعے گناہوں سے پاکی کو یکساں نظر سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا جب معاملاتِ زندگی میں بندگی کا تصور ہی نہیں رہے گا تو ایک عام ذہن کی مذہب میں کیا دلچپی رہ جائے گی۔ لہٰذا مذہب بیزاری کے مقابلے کے لئے مذہبِ اسلام کے تعارف نو کی ضرورت ہے۔ اسلام کو ایک نظریہ حیات کی شکل میں پیش کرنے کی ضرورت ہے اور یہ نظریہ محض تقاریر اور سیمینار کے ذریعے نہیں، بلکہ عملی مثالوں کے ذریعے ہی اشاعت پا سکتا ہے۔

سوال: مذہب کی عملی نظیر کو پیش کرنا بہر حال ایک اہم کام ہے۔ مگر کیا عقائد کی روشنی میں چند بنیادی سوالات، جیسے کہ انسان کا مقصد وجود، وجود خدا، انسان کا خدا سے تعلق، اخلاق کے معیارات وغیرہ، کے سلسلے میں سائنس کوئی رہنمائی پیش کر سکتی ہے۔ اور کیا ملحدانہ نقطہ نظر سے مرعوب ذہنیت والے نوجوان کو راہ دکھا سکتی ہے۔

جواب: اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم قرآن کی بنیاد پر کوئی ڈسکورس کھڑا کرنے کے بجائے، دیگر نظریہ ہائے حیات کو موضوع بحث بنا کر اسلام کی بات کرتے ہیں۔ یہ ہماری قرآن سے دوری کا ثبوت ہے۔ قرآن کے فلسفہ، نظریات اور نظام ہائے زندگی کو ڈسکورس کی حیثیت میں کھڑا کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً قرآن نے نظام معیشت کا جو تصور پیش کیا، اس میں ہم زکوٰۃ کی ڈھائی فیصد ادائیگی سے آگے ہی نہیں بڑھ پاتے۔ جبکہ قرآن جس نظام معیشت کی بات کرتا ہے وہ ایک ڈیولپمنٹ فنڈ ہے، جو ہر شخص کو اس کے زائد از ضرورت سرمائے کو خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی طرز پر قرآن کا سارا فلسفہ لوگوں کے سامنے لانے کی ضرورت ہے، جو انسانیت کی فلاح پر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور جہاں تک مرعوب ذہن کا سوال ہے، یہ مرعوبیت دلائل کی بنیاد پر ہے۔ جس طرح الحادزدہ سائنسی فلسفوں نے دلائل دئے، اسی طرح قرآن کے فلسفوں کو مدلل انداز میں پیش کیا جانا چاہئے۔ ہمارے نوجوان جو دین سیکھتے ہیں، وہ محض ایک پدرانہ تحکم کی بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے، اور فریق مخالف اسے دلائل کی قوت سے مسمار کر دیتا ہے۔ لہٰذا نوجوان مرعوب ہو جاتے ہیں۔ جبکہ خود قرآن دلائل اور برہان سے بات کرتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہماری نسلوں کو اسی انداز قرآنی سے دین کی تعلیم نہ دی جائے۔

سوال: مسلم طلبہ میں سائنسی تحقیق کی جانب رجحان کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا مشکلات آپ کو درپیش ہوتی ہیں جب آپ مسلمانوں کو سائنس اور تحقیق کی جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: نہ صرف مسلم بلکہ عام طلبہ کے تناظر میں بھی اگر اس سوال کو پرکھا جائے تو اس میں سب سے اہم بات گھروں کا ماحول ہے۔ ہمارے گھروں میں بچے اپنی بالیدگی میں جن باتوں کو اپنے اطراف پاتے ہیں، اسی انداز کی سوچ ان میں پروان چڑھتی ہے، جیسے مال کمانا، جمع کرنا، مستقبل کے لئے سرمایہ کاری، شادی بیاہ کے انتظامات اور بہتر معیار زندگی وغیرہ۔ جب کہ سائنسی تحقیقات جیسے کام اصلاً سماجی بہبود کے زمرے میں آتے ہیں، جس کے تعلق سے ہمارے گھروں میں تذکرہ اور اس پر عمل انتہائی کم ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہماری شخصیت سازی کے عمل میں یہ عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی شخصیت سے یہ امید کیسے کی جائے گی کہ وہ جلد کمائی میں مدد دینے والے پروفیشنل کورسیس کے بجائے کسی صبر آزما تحقیقی میدان کا انتخاب کرے اور سماج کی خدمت کرے۔

سوال: بحیثیت مجموعی، سماج میں کن رجحانات کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے تا کہ لوگ تحقیقی میدانوں کی طرف رجوع کریں، اور جس کے نتیجے میں سماج کا بھی ایک عمومی تفکر، تعقل اور تدبر کا مزاج بنے؟

جواب: اس سلسلے میں گھروں کے ماحول میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے، کہ ہم لینے کے بجائے دینے والے بنیں۔ خود قرآن میں مسلمانوں کو جگہ جگہ انفاق کی ترغیب دی گئی۔ پہلی ہی سورہ میں ایاک نستعین کا سبق ہماری تربیت کی بنیاد ہونا چاہئے۔ ریسرچ کے میدان میں اسکالرشپس اور ریزرویشن کے حوالے سے جو جدوجہد مسلمان کرتے ہیں، انہیں یہودیوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے جو اقلیت میں ہونے کے باوجود سب سے زیادہ نوبل انعامات پاتے ہیں۔ لہٰذا اقلیت میں ہونا یا مسلمان ہونا ہماری پسماندگی کا سبب نہیں، بلکہ ہماری پسماندگی ہماری کم محنتی کا مظہر ہے۔ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے، اور اگر ہم اقلیت میں ہیں تو ہمیں اکثریتوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ تعصّبات کا رونا بھی ہمارے ایمان کی کمزوری کا مظہر ہے۔ اگر ہم اپنا سو فیصد کسی کام میں لگاتے ہیں اور نتائج کی امید اللہ سے کرتے ہیں تو تعصّبات کا شکوہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ مگر ایک عام رویہ اب یہ ہے کہ اپنی ناکامیوں کی وجوہات کو تعصب سے جوڑ دیا جائے۔

سوال: مسلم طلبہ میں بیشتر ایسے ہیں جو معاشی تنگ دستی کے شکار ہیں۔ تحقیقی کاموں میں دلچسپی رکھنا اور آگے بڑھنا ان کے لئے کافی مشکل ہوتا ہے۔ ان حالات کے سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب: سب سے پہلے ایسے طلبہ کو صبر کی تلقین کرنا چاہوں گا کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صبر سے میرا مطلب وہ ہے جو اس کے اصل عربی مادہ سے حاصل ہوتا ہے یعنی ''ڈٹے رہنا''۔ ایسے طلبہ کو حتی الامکان اپنی دلچسپی کے تحقیقی میدان میں خوب محنت اور لگن سے ڈٹے رہنے کی ضرورت ہے۔ دوسرا پہلو اس سلسلے میں ایک بیدار سماج کے حوالے سے ہے۔ جس علاقے میں ایسے طلبہ ہوں اور وہاں کے مکین جو اس طالب علم کے ساتھ محلے کی مسجد میں نماز ادا کرتے ہوں، اگر اس کے حالات سے باخبر نہ ہوں یا اس اعانت نہ کر سکیں تو ایسے ہی نمازیوں کی تباہی کی خبر سورۃ الماعون میں سنائی گئی ہے (جو ضرورت کی چیزیں ایک دوسرے کو دینے سے منع کرتے ہیں)۔ لہٰذا یہ ذمہ داری اس معاشرے کی ہے کہ ایسے طلبہ کی اعانت کرے اور اپنی زندہ ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ جب یہ ماحول پروان چڑھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو فکر مندی سے آزاد کرے گا۔ اگر ایسے کاموں کے لئے آپ ادارہ جاتی کاموں کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں شفافیت کے بڑے مسائل آتے ہیں اور لوگ میں دوبارہ اپنی جیب سے دینے کے بجائے لوگوں سے جمع کرنے کا مزاج بنتا ہے۔ لہٰذا ایسی کوششوں کی ابتدا پہلے ہماری ذات کی جانب سے ہونی چاہئے۔

سوال: آپ نے ''ماہنامہ سائنس'' کی اشاعت کے علاوہ ایک ادارہ بنام ''انجمن فروغ سائنس'' قائم کیا۔ اس کی غرض وغایت اور سرگرمیوں پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: یہ ادارہ ''ماہنامہ سائنس'' کی اشاعت سے قبل ۱۹۹۲ء میں وجود میں آیا۔ جس کے بانیان میں سید حامد صاحب، حکیم عبدالحمید صاحب اور عبدالسلام صاحب (نوبل انعام یافتہ) بحیثیت سرپرست رہے۔ مگر افراد کی مصروفیات کے باعث کچھ خاص پیش رفت اس سلسلے میں نہیں ہو سکی، حالانکہ ادارہ اب بھی قائم ہے۔ اسی دوران ہم قرآن کانفرنس بھی انعقاد کرتے رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے

کہ قرآن پر فقہی کے بجائے علمی انداز سے مزید کام کیا جائے، جس کے لئے ہم اس ادارہ کو جاری وساری رکھنے کے لئے افراد کو بھی تلاش کر رہے ہیں۔
اسی طرح ہم نے ''نیشنل سائنس کانگریس'' کی طرز پر ''اردو سائنس کانگریس'' کا بھی انعقاد کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا اردو داں طبقہ میں جو حضرات سائنس سے دلچسپ رکھتے ہیں ان کو ایک پلیٹ فارم پر لایا جائے۔ یہ کانفرنس پہلے پہل ذاکر حسین کالج میں، پھر علیگڑھ میں ہوئی، اور گذشتہ دنوں میں اسے مولانا آزاد یونیورسٹی میں منعقد کیا گیا، اس کے ساتھ ہی ''اردو سوشل سائنس کانگریس'' بھی منعقد کی جاتی ہے۔ لہٰذا اب یہ سرکار سے منظور شدہ، مرکزی یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمی کا حصہ بن چکی ہے، لہٰذا ہمیں یہ امید ہے کہ آئندہ بھی یہ ہوتی رہے گی، اور اگر کسی وجہ سے یونیورسٹی میں نہ ہو تو انجمن فروغ سائنس کے ذریعے اسے منعقد کیا جاتا رہے گا۔
سوال: ادب کے علاوہ، جن سماجی یا سائنسی علوم میں تحقیقات اردو زبان میں ہوتی ہیں، وہ بہت زیادہ معیاری نہیں ہوتی۔ یہ ایک عمومی مفروضہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔
جواب: یہ محض ایک مفروضہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، اور اس کے ذمہ دار اصلاً اہل زبان ہیں۔ کیونکہ اردو زبان میں بلاشبہ نہایت وسعت ہے بالخصوص سماجی علوم کے حوالے سے تو میدان کھلا ہے۔ سائنس کے معاملے میں کچھ حدود ہو سکتی ہیں مگر ایسی نہیں کہ جن سے کام رک جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ اردو اسکولوں میں انگریزی زبان کی تدریس کا نظم اکثر ناقص ہوتا ہے۔ لہٰذا اردو داں طبقہ انگریزی میں کئے گئے کاموں کے حوالے سے تشنہ بھی رہ جاتے ہیں۔ اس محاذ پر مولانا آزاد یونیورسٹی میں ہم نے ادارتی سطح پر کوششیں شروع کی ہیں۔ اردو سائنس کانگریس وغیرہ سے بھی کسی حد تک یہ کام ہوسکتا ہے۔
سوال: موجودہ دور میں جب کہ سائنس میں مسلسل تحقیق کے نئے میدان دریافت ہو رہے ہیں ایسے میں طلبہ کے لئے کیا بات کہنا چاہیں گے؟
جواب: پہلی سیڑھی تو یہ ہے کہ طلبہ تحقیقی میدان میں دلچسپی کو پروان چڑھائیں۔ اور ایک وسیع سائنسی پلیٹ فارم پر اپنی تعلیم کی بنیاد قائم کریں۔ پھر آگے چل کر دلچسپی کی مناسبت سے نینوٹکنالوجی، بایوٹکنالوجی، مصنوعی ذہانت، جینیاتی انجینیرنگ، روبوٹکس وغیرہ بے شمار مواقع سامنے آئیں گے۔ اور یہ سائنسی میدان مستقبل قریب میں بہت تیزی کے ساتھ فروغ پائیں گے۔ مثال کے طور پر آئندہ دس سالوں میں وکیلوں کے کام جیسے کیس کا جائزہ لینا، کیس تیار کرنا وغیرہ جیسے کام کے لئے سافٹ ویئر تیار کئے جا رہے ہیں۔ اسی خودکاری کے نتیجے میں بہتیرے غیر خودکار کاموں کی مانگ کم ہوتی جائے گی۔ اس بنیاد پر ملت کے مفکرین کو ایک زبردست تعلیمی ایجنڈا ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔
سوال: بحیثیت وائس چانسلر آپ کی معیاد میں مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں کار گر تبدیلیاں محسوس کی گئی ہیں۔ آپ اس ضمن میں اپنی کوششوں پر روشنی ڈالیں۔
جواب: اس یونیورسٹی کے تمام ہی شعبہ جات میں ہم ابھی بد نظمی کے خاتمے اور سنجیدہ و منظم انداز سے کارکردگی کو یقینی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ اس طرح کہ ہر شعبہ اور ہر شخص کا دائرہ کار متعین کر دیا جائے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ کہ یہ محض کسی شعبہ اردو کا پھیلاؤ نہیں، بلکہ ایک اردو یونیورسٹی ہے، جس کا مقصد اردو میں علوم کی منتقلی اور اردو زبان میں مزید علمی مواد کی تیاری ہے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے اساتذہ کو کئی ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں اور ان سے امیدیں بھی ہیں۔ حالیہ اردو سائنس کانگریس میں سائنسی اصطلاحات پر مبنی ایک فرہنگ کو بھی شائع کیا گیا۔ تاکہ طلبہ سائنسی اصطلاحات کا با آسانی اردو زبان میں مفہوم سمجھ سکیں۔
سوال: قرآن پر سائنسی نقطہ نظر سے جو علمی کام کی کوششیں آپ نے کی ہیں، اس سلسلے میں آپ کے محرکات کیا رہے، کن شخصیات نے آپ کو متاثر کیا۔
جواب: سورۃ القصص کی آیت نمبر 85، اس ضمن میں میرے لئے بنیادی محرک رہی۔ جس نے مجھے یہ بتایا کہ قرآن مجھ پر فرض کیا گیا ہے۔ اور قرآن کی فرضیت کا مجھ سے تقاضا یہ ہے کہ میں قرآن کی طرف رجوع کروں، اس میں دیئے گئے علوم سے استفادہ کروں۔ لہٰذا میں نے اس کام کو شروع کیا۔ پڑھنے اور سمجھنے کے بعد مجھے اس بات کا ادراک ہوا کہ یہ اسلام تو مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا میں قرآن ہی کو اپنا اصل محرک مانتا ہوں۔
سوال: قرآن کی بنیاد پر آپ نے جو کام کیا، اس سلسلے میں ایک مثبت ردعمل اور بیداری لوگوں کے درمیان نظر آئی۔ آپ کے نزدیک اس کی کیا وجوہات ہوسکتی ہیں؟
جواب: اس کی بنیادی وجہ خود قرآن ہی ہے۔ کیونکہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ یہ دلوں پر اثر کرنے والی کتاب ہے۔ الٹا ہماری جانب سے اس سلسلے میں نہایت کوتاہی رہی ہے۔ خود مدارس کا حال دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں پر بھی قرآن کی بنیاد پر اصل تعلیم نہیں ہوتی۔ بلکہ قرآن ان کے نصاب کا محض ایک جزوی حصہ ہے۔ لہٰذا قرآن کی دعوت کو عام کرنا اس وقت مسلمانوں کے لئے انتہائی اہم کام ہے۔ قریب قریب ایک ہزار سال قرآن سے دوری کی بنیاد پر، ہم خود اپنے زوال کی شہادت دے رہے ہیں۔
سوال: آپ اپنے طالب علمی کے زمانے سے کوئی خاص پیغام قارئین اور طلبہ کے لئے دینا چاہیں گے؟
جواب: یوں تو بہت سی باتیں ہیں، مگر ایک خاص بات میں آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ابتدائی تعلیم سرکاری اسکول سے حاصل کی، جہاں تعلیم کا بالخصوص انگریزی زبان سیکھنے کا کوئی خاص نظم نہیں تھا۔ چھٹی جماعت سے انگریزی سیکھنے کے لئے میں نے راستوں کے اطراف لگے بورڈ اور پرانے اخبارات کے ذریعے انگریزی سیکھنے کی کوشش شروع کی۔ اس جذبہ کے ساتھ کوشش شروع کی اور محنت و لگن سے کام کرتا رہا تو اللہ نے ایک وہ دن بھی دکھایا کہ مجھے ہارورڈ یونیورسٹی میں Islam and Ecology کے عنوان پر بات کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ ہارورڈ پریس کی کتابوں میں میرا ایک مضمون بھی شامل ہے۔ الغرض یہ کہ سخت محنت اور سچی لگن سے کسی نیک مقصد کی جستجو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضرور بالضرور قبول ہوتی ہے۔ طلبہ کے لئے یہی خاص پیغام ہے کہ محنت اور لگن سے اپنے مقصد کی جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہیں، اور خدا سے یقین کے ساتھ دعا کریں۔

سائنسی تحقیق
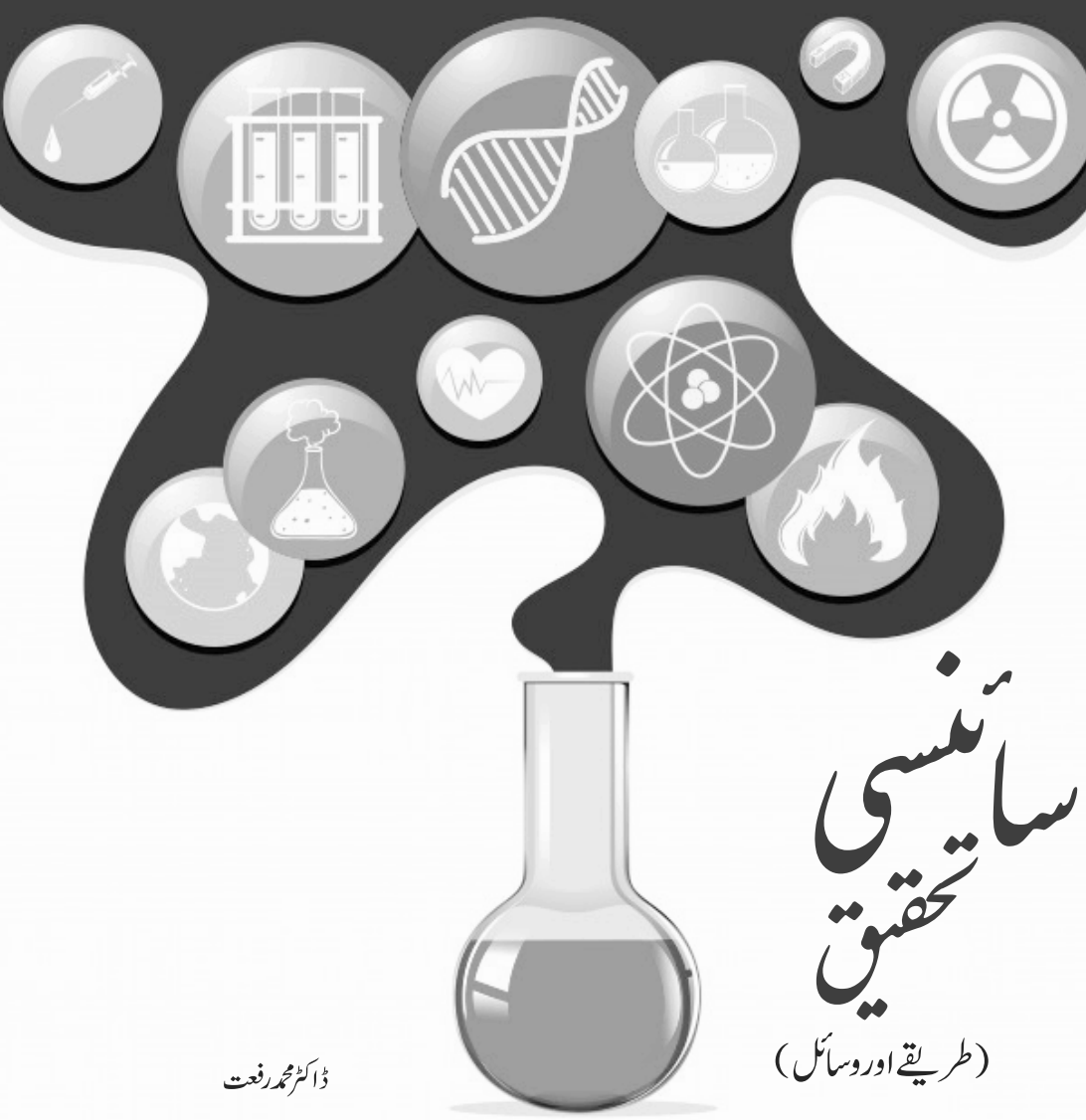
(طریقے اور وسائل)

ڈاکٹر محمد رفعت

سائنس کی اصطلاح محدود معنوں میں بھی استعمال ہوتی ہے اور وسیع معنوں میں بھی۔ وسیع معنیٰ لیے جائیں تو سائنس کے موضوع میں اشیاءِ کائنات، ذی حیات مخلوقات اور انسانی سماج، سب شامل ہیں۔ البتہ محدود معنیٰ کے لحاظ سے سائنس کے دائرۂ بحث و جستجو میں اشیاءِ کائنات شامل ہیں اور جانداروں کی زندگی کے وہ پہلو جو طبیعی (Physical) نوعیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر سائنس کے محدود مفہوم میں انسانی شخصیت اور انسانی سماج سے متعلق مباحث کو شامل نہیں کیا جاتا۔ سائنس کے محدود معنیٰ کے لحاظ سے علوم کے یہ شعبے، سائنس سے متعلق سمجھے جاتے ہیں: طبیعیات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، طبقات الارض (Geology)، فلکیات (Astronomy)، اور حیاتیات (Biology)۔ اصولاً 'سائنس' نامی اصطلاح میں معلومات کا انطباق (Applications) یا استعمال شامل نہیں ہے بلکہ اس انطباق یا استعمال کو ٹکنالوجی (Technology) کہا جاتا ہے۔ تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ بہت سی تحقیقات ایسی ہیں جن کو سائنسی مباحث کا حصہ بھی سمجھا جاسکتا ہے اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت کا بھی۔ البتہ سائنس سے زندگی اور تصور کائنات کا تعلق سمجھنے کے لیے اچھا یہی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان فرق کو واضح طور پر سامنے رکھا جائے اور ان دونوں کو ایک نہ سمجھا جائے۔

بنیادی تصورات

انسان کی علمی کاوشیں ہوں یا عملی سرگرمیاں، بہر حال ان کا رخ اس تصور کائنات سے متعین ہوتا ہے جسے انسان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کیا ہوا ہے۔ پچھلی تین صدیوں میں مغربی دنیا میں سائنس کا جو ارتقاء ہوا، وہ زیادہ تر ملحدانہ تصور کائنات کے تحت ہوا۔ یعنی سائنس کے فلسفے میں یا تو خدا کا انکار کیا گیا یا خالق کائنات کے وجود کا اقرار کرنے کے باوجود اسے کائنات کا حاکم، مدبر اور منتظم تسلیم نہیں کیا گیا۔ تاہم مغربی سائنس، اشیاء کائنات سے متعلق علم حاصل کرنے کے لیے، کچھ بنیادی تصورات کو اساس (Basic) قرار دیتی ہے۔ بالفاظ دیگر ان تصوارت کے بدیہی (Obvious) ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ گویا وہ ثبوت کے محتاج نہیں بلکہ انسانی ذہن ان کی معقولیات و وجدانی (Intuitive) سطح پر ادراک کر لیتا ہے۔ مغربی فلسفۂ سائنس کے نزدیک یہ ادراک ان تصورات کو مان لینے کے لیے کافی ہے۔ مغربی سائنس کے یہ اساسی تصورات درج ذیل ہیں:

(الف) اشیاء کائنات اپنے متعین خواص (Charateristics) رکھتی ہیں، جن کو مشاہدے (Obsevation) کے ذریعہ جانا جاسکتا ہے۔

(ب) کائنات کی اشیاء کے درمیان تعامل (Interaction)، بعض قوانین کے

تحت ہوتا ہے۔ ان قوانین (Laws of nature) کو بھی مشاہدات پر مبنی غور وفکر کے ذریعے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

(ج) کائنات میں پیش آنے والی تبدیلیوں میں سبب (Cause) اور نتیجے (Effect) کا تعلق ہوتا ہے۔ اس تعلق کی نشان دہی، مذکورہ بالا قوانین فطرت کا ایک اہم پہلو ہے۔ تاہم سارے فطری قوانین ایسے نہیں ہیں جو محض سبب اور نتیجے کے بیان پر مشتمل ہوں۔ ایسے قوانین فطرت بھی موجود ہیں جو مجموعی صورت حال کو بیان کرتے ہیں (جو اسباب کے تنوع کے باوجود نہیں بدلتی) اس کی ایک مثال کائنات میں موجود توانائی (Energy) کی کل مقدار کے یکساں رہنے کا قانون ہے۔ اس کو توانائی کی بقا کا اصول کہا جاتا ہے۔ یعنی Laws of Conservation of Energy۔ اس کے مطابق توانائی شکلیں تو بدلتی ہے (کبھی روشنی کی شکل اختیار کرتی ہے تو کبھی حرکت کی) لیکن اس کی کل مقدار نہیں بدلتی۔ یہ اصول، سبب اور نتیجے کی اصطلاحوں سے بالا تر ہے۔ (ان اصطلاحوں کی زبان میں اس اصول کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔)

اسلامی تصور کائنات سے استنباط

پچھلی دو صدیوں کے دورِ غلامی سے پہلے، مسلمان بھی سائنس کے میدان میں تحقیقی سرگرمیاں انجام دے رہے تھے۔ یہ سائنسی کاوشیں، اسلامی تصور کائنات کے تحت انجام پاتی تھیں۔ اسلام کا تصور کائنات مندرجہ بالا تین باتوں کا قائل ہے۔ (جن کو مغربی سائنس کے بنیادی تصورات کے تحت ہم نے بیان کیا ہے۔) البتہ ملحدانہ تصور کائنات، ان تصورات کی کوئی توجیہ نہیں کرسکتا۔ اسلامی تصور کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تصورات کی توجیہ پیش کرتا ہے۔

ان تصورات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اشیاء کائنات، متعین خواص کی حامل ہیں۔ ان خواص کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مشاہدے پر غور وفکر کے ذریعے، علم کا حصول ممکن ہے اور اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اسباب کے ذریعے نتائج کو ظہور میں لاتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات قرآنی سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف) بعض مثالوں کے ذریعے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اشیاء میں متعین خواص موجود ہیں۔

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتاً وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ۔ ثُمَّ كُلِيْ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلاًيَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ إِنَّ فِيْ ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (سورۃ النحل: ۶۸۔۶۹)

''اور دیکھو! تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی ہے کہ پہاڑوں میں اور درختوں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا، اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفاء ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔''

یہاں شہد کا خاصہ بتایا گیا ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے شفاء ہے۔

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيْدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (سورۃ حدید: ۲۵)

''اور ہم نے لوہا اتارا، جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں''۔

یہاں لوہے کی خاصیت یعنی مضبوطی کا ذکر ہے، جس کی بنا پر وہ لوگوں کے کام آتا ہے۔

(ب) قرآن مجید بتاتا ہے کہ کائنات کے ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کردیا گیا ہے۔

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِيْ كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظاً ذَٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (حٰم سجدہ: ۱۲)

''تب اس (اللہ) نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے''۔

وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجاً۔ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبّاً وَنَبَاتاً۔ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافاً (سورۃ النبا: ۱۴۔۱۶)

''اور ہم نے آسمان سے لگا تار پانی برسایا تاکہ اس کے ذریعے سے غلہ اور سبزی اور گھنے باغ اگائیں''۔

یہ ایک مثال ہے جو کائنات میں اسباب اور نتائج کے درمیان تعلق کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

(د) قرآن مجید بتاتا ہے کہ انسان کو آنکھ اور کان کی نعمتوں سے اللہ نے نوازا ہے۔ ان حواس سے مشاہدہ کر کے اور مشاہدے کی بنیاد پر غور وفکر کر کے انسان علم حاصل کرسکتا ہے۔

وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولـٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولاً (بنی اسرائیل: ۳۶)

''کسی ایسی بات کی پیروی نہ کرو جس کا تمھیں علم نہیں۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل، سب کی باز پرس ہونی ہے''۔

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ جب انسان کو سمع، بصر اور فواد کی شکل میں علم حاصل کرنے کے ذرائع حاصل ہیں تو پھر اسے چاہیے کہ ان باتوں کی پیروی نہ کرے جن کا اسے کوئی علم نہیں ہے۔ اس آیت میں اصل تلقین تو یہ کی گئی ہے کہ انسان کے رویے کی بنیاد، علم پر ہونی چاہیے لیکن اس سلسلے میں سمع، بصر اور فواد کے حوالے سے، ان کے ذرائع علم ہونے کی توثیق ہوجاتی ہے۔

انسان کا رول

کائنات میں قوانین فطرت کی موجودگی کے ادراک کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قوانین کی موجودگی اور انسان کی آزادی عمل میں کیا تعلق ہے؟ بالفاظ دیگر کیا کائنات کے پابند ضوابط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر واقعہ، قوانین فطرت کی کارفرمائی کی بنا پر خود بخود ہوتا جارہا ہے۔ اور انسان مجبور محض ہے اور وہ واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ مغربی سائنس کے فلسفے میں اس سوال پر واضح بحث نہیں ملتی۔ البتہ مغرب کے اہل سائنس کے رویے سے اس سوال کا عملی جواب مل جاتا ہے۔ وہ رویہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیق کے لیے قوی اور درست محرک، ٹیکنالوجی کی ترقی کو قرار دیا گیا ہے۔ ٹیکنالوجی، سائنس کے انطباق واستعمال ہی کا نام ہے۔ چنانچہ ٹیکنالوجی کے استعمال پر انسان کا قادر ہونا، اس امر کی

کائنات میں قوانین فطرت کی موجودگی کے ادراک کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قوانین کی موجودگی اور انسان کی آزادی عمل میں کیا تعلق ہے؟ بالفاظ دیگر کیا کائنات کے پابند ضوابط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر واقعہ، قوانین فطرت کی کارفرمائی کی بنا پر خود بخود ہوتا جارہا ہے۔ اور انسان مجبور محض ہے اور وہ واقعات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

علامت ہے کہ انسان کو آزادیٔ عمل حاصل ہے۔

انسان کے عمل کرنے کی آزادی کو مان لینے بعد قوانین فطرت اور دنیا میں پیش آنے والے واقعات کے مابین تعلق کی ایسی تعبیر دریافت کی جانی چاہیے جس میں آزادی عمل کی گنجائش نکلتی ہو۔ مغربی سائنس نے اس سلسلے میں دو طرح کی تعبیرات پیش کی ہیں:

(الف) بیسویں صدی سے قبل کی سائنس (اسے روایتی یا Classical) کہا جاتا ہے) میں قوانین فطرت کے علاوہ کسی شئی یا اشیاء کے مجموعے کی ابتدائی حالت کو بھی مشاہدہ کا اہم حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ابتدا سے مراد مشاہدے کی ابتدا ہے۔ اس کی ایک آسان مثال یہ ہے کہ ایک شخص گیند کو ڈھلان پر رکھ دیتا ہے، ڈھلان میں اونچی سطح پر گیند کی موجودگی، اس گیند کی ابتدائی حالت ہے۔ قانون ثقل کے مطابق پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ گیند نیچے کی طرف جانے لگے گی۔ مشاہدے سے اس پیشن گوئی کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس مثال میں ابتدا میں ڈھلان کی بلندی پر گیند کو رکھنا انسانی فعل ہے۔ اس کام کو کرنے والا شخص، آزاد ہے کہ گیند وہاں رکھے یا نہ رکھے۔ بظاہر کوئی قانون فطرت اس شخص کو مجبور نہیں کرتا کہ کیا کرے۔ البتہ جب وہ گیند رکھ دیتا ہے تو قانون فطرت (یعنی کشش ثقل کا قانون) اپنا کام کرنے لگتا ہے اور گیند کو نیچے لے جاتا ہے۔ اس تعبیر کے مطابق (جس میں شئے کی ابتدائی حالت کو زیر بحث لایا گیا ہے) انسان کو آزادی عمل ان معنوں میں حاصل ہے کہ وہ اپنے کسی اقدام میں کسی شئے یا اشیاء کی ابتدائی حالت متعین کرسکتا ہے یا ترتیب دے سکتا ہے۔ اس مرحلے کے بعد، انسان کا رول ختم ہوجاتا ہے اور قوانین فطرت کے مطابق نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(ب) بیسویں صدی میں سائنس کے تصورات میں غیر معمولی تبدیلیاں ہوئیں۔ اب انسان کے رول کے بارے میں فہم، روایتی سائنس پر مبنی فہم سے مختلف ہے۔ بیسویں صدی میں کوانٹم نظریہ (Quantum Concept) سامنے آیا۔ جس کو مغربی سائنس نے مان لیا۔ اس کے مطابق، انسانی مشاہدے کے نتیجے میں، زیر مشاہدہ شئی یا مجموعہ اشیاء کی کیفیت میں تغیر واقع ہوجاتا ہے۔ اس فہم کے مطابق، انسان مجبور محض قرار نہیں پاتا، بلکہ پیش آنے والے واقعات میں انسانی مداخلت، واقعات اور نتائج کو بدل دیتی ہے۔ کوانٹم نظریہ میں یہ بھی سمجھا گیا ہے کہ متوقع نتائج کی قطعی پیشن گوئی ممکن نہیں۔ بلکہ امکانات کا ایک وسیع دائرہ ہے جن میں ہر امکان کا ظہور ممکن ہے۔ اس نظریہ کے مطابق سائنس صرف یہ اندازہ لگا سکتی ہے کہ کس کے ظاہر ہونے کی توقع زیادہ ہے اور کتنی زیادہ ہے۔ انسان کی آزادی عمل تسلیم کرلینے کے بعد، سائنس اور ٹیکنالوجی کے مابین رشتے کی توجیح ممکن ہوجاتی ہے۔

اسلامی تصور کائنات میں انسان کی حیثیت

اسلامی تصور کے مطابق انسان آزاد ہستی ہے، وہ عمل پر قادر ہے اور اپنے عمل کے لیے جواب دہ ہے۔

تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ وَهُوَ عَلَی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاةَ لِیَبْلُوَکُمْ أَیُّکُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُورُ (الملک: ۱ ۔ ۲)

’’نہایت بزرگ و برتر ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر کرنے والا بھی‘‘۔

اسلامی تصور کائنات انسان کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کائنات کی بہت سی اشیاء سے خدمت لے سکتا ہے۔ مثلاً انسان کو قدرت دی گئی ہے کہ وہ سمندر میں کشتی چلا سکتا ہے۔

اللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُونَ (سورۂ جاثیہ: ۱۲)

’’وہ اللہ ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار رہو‘‘

ظاہر ہے کہ پانی کی سطح پر کشتی کا چلنا، قوانین فطرت کے تحت ہی ہوگا۔ آیت بالا کی روشنی میں قوانین فطرت کی نوعیت ایسی ہے کہ انسان کے لیے کشتی چلانا ممکن ہوجاتا ہے۔ انسان کی آزادی عمل کے سیاق میں اسلامی تصور کائنات کی پیش کردہ اصطلاح ’تسخیر‘ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

وَسَخَّرَ لَکُم مَا فِیْ السَّمَاوَاتِ وَمَا فِیْ الْأَرْضِ جَمِیْعاً مِّنْهُ إِنَّ فِیْ ذَلِکَ لَآیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَتَفَکَّرُونَ (سورۂ جاثیہ: ۱۳)

’’اس (اللہ) نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزوں کو اپنی طرف سے، تمہارے لیے مسخر کردیا۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور فکر کرنے والے ہیں‘‘۔

زمین اور آسمانوں کی چیزوں کے انسان کے لیے مسخر ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اشیاء کائنات، انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ اشیاء میں بہت سی ایسی ہیں (مثلاً کشتیاں) جن سے انسان خدمت لیتا ہے اور مختلف طریقوں سے اپنے استعمال میں لاتا ہے۔قوانین فطرت کا علم، اشیاء کے استعمال کرنے میں، انسان کی مدد کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْأَرْضَ ذَلُولاً فَامْشُوا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَ کُلُوا مِن رِّزْقِهِ وَإِلَیْهِ النُّشُور (سورۃ الملک: ۱۵)

''وہی (اللہ) تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع کر کھا ہے۔ چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔ اس کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے۔''

سائنسی تحقیق کے طریقے

سائنسی تحقیق کے لیے، تحقیق کرنے والا ابتدائی مشاہدے سے آغاز کرتا ہے۔ ابتدائی مشاہدے سے تحقیق کی طرف توجہ ہوتی ہے، جس کے عوامل بہت ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے محقق، کسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو اور اس کو تحقیق کا موزوں راستہ مل جائے۔ روز مرہ کے مشاہدات بھی، انسان کے ذہن کو تحقیق کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جیمس واٹ نے پتیلی میں ابلتے ہوئے پانی کو دیکھا۔ ابلتے پانی سے نکلنے والی بھاپ، پتیلی کے ڈھکن کو اوپر اٹھا دیتی ہے۔ اس مشاہدے نے جیمس واٹ کو آمادہ کیا کہ بھاپ کی توانائی پر باقاعدہ تحقیق کر کے منصوبہ بندی کرے اور اس توانائی کے مفید استعمال کی صورتیں نکالے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں اس نے بھاپ کا انجن ایجاد کیا جو پتیلی کی ڈھکن سے کہیں زیادہ وزنی ریل گاڑی کو کھینچ کر لے جا سکتا تھا۔

ابتدائی مشاہدے کے بعد محقق، منصوبہ بند مشاہدے کا آغاز کرتا ہے۔ اس میں وہ ان سوالات کو متعین کرتا ہے، جن کے جوابات اسے تلاش کرنے ہیں۔ سوالات جتنے واضح ہوں گے اتنے ہی تحقیق کے مراحل آسان ہو جائیں گے۔ سوالات کی ترتیب، غور وفکر اور محنت کا تقاضہ کرتی ہے۔ اب تک اس شعبۂ علم سے متعلق جو معلومات حاصل ہو چکی ہوتی ہیں ان کو سامنے رکھنا بھی محقق کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

سوالات کی ترتیب کے بعد مشاہدات کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہین وہ تین ہیں: بیان (Description)

پیمائش (Measurement) اور

منضبط تجربہ (Controlled Experiment)

حیاتیات، علم طبقات الارض اور فلکیات میں زیر مشاہدہ جانداروں اور اشیاء کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انسان نے بہت کچھ جان لیا اور دیکھ لیا ہے مگر ہر قدم پر محقق کو احساس ہوتا ہے کہ ابھی بہت کچھ دیکھنا اور جاننا باقی ہے۔ روزانہ نئے پودے اور زندہ انواع کا مشاہدہ ہوتا ہے اور ہر آن اس وسیع دنیا میں نئے اجرام دریافت ہوتے ہیں۔ سائنس کے ان شعبوں میں زیر مشاہدہ جانداروں یا اشیاء کے براہ راست (یا آلات کی مدد سے) نظر آنے والی خصوصیات اور بناوٹ (Structure) کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ باریک بینی سے مشاہدہ کرنے والا اپنے مشاہدے کو بیان (Describe) کرتا ہے۔ اس بیان میں الفاظ اور جملوں کے علاوہ چارٹ، جدول، گراف اور تصاویر سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ اس شئے کے جو حواس یا اجزاء، دوسری ملتی جلتی اشیاء سے ممتاز نظر آئیں، ان پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ درست بیان کے لیے مشق درکار ہوتی ہے اور اساتذہ و ماہرین کی رہنمائی بھی ناگزیر ہے۔

اشیاء کے بہت سے خواص ایسے ہیں جن کی گنتی (Counting) کی جا سکتی ہے یا ان کو ناپا تولا جا سکتا ہے۔ مشاہدے کے اس طرز کو پیمائش (Measurement) کہا جاتا ہے۔ طبیعیات اور کیمیا جیسے شعبوں میں پیمائش کی بڑی اہمیت ہے۔ وہی مشاہدات اِن شعبوں میں قابل ذکر پیش رفت کی طرف لے جا سکتے ہیں جن کا تعلق پیمائش سے ہوتا ہے۔ پیمائش کے لیے سائنسی آلات کا استعمال ناگزیر ہے۔ ہر آلہ کی بنیاد کسی سائنسی نظریے پر ہوتی ہے۔ ایک اچھے محقق کو آلے سے کام لینا تو یقیناً آنا چاہیے لیکن اسے اس نظریے سے بھی واقف ہونا چاہیے جو آلے کی ایجاد کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس طرح محقق کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ زیر بحث پیمائش کے لیے مجوزہ آلہ موزوں ہے یا نہیں۔ وہ آلے کی محدودیت (Limitations) سے بھی واقف ہوگا۔ یعنی کن حالات میں وہ آلہ، درست معلومات دیتا ہے اور کب نہیں دیتا ہے۔

طبیعیات، کیمیا اور ایک حد تک حیاتیات طبقات الارض کے شعبوں میں منضبط تجربات کے انجام دینے کا امکان موجود ہے۔ چنانچہ ان علوم میں منضبط تجربات، تحقیق کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔ محقق محض فطری حالت میں اشیاء کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنی تجربہ گاہ میں (Laboratory) میں خود اشیاء کی بناوٹ، خواص اور افعال کا اور ان کے باہمی تعامل کا مطالعہ کرتا ہے۔ اپنے حسب منشا محقق بیرونی عمل کے اثر کو کم یا زیادہ کر سکتا ہے۔ مثلاً تجربہ گاہ کے اندر وہ ایک مخصوص درجۂ حرارت پر مشاہدہ کر سکتا ہے، مصنوعی طریقوں سے برقی و مقناطیسی اثرات ڈال سکتا ہے، ہوا کے دباؤ کو گھٹا بڑھا سکتا ہے اور اتفاقی عوامل کے اثرات سے مشاہدہ اشیاء کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مجرد پیمائش یا منضبط تجربات سے جو مشاہدات حاصل ہوتے ہیں، محقق ان کو ترتیب دیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جن عوامل سے اس نے آغاز کیا تھا ان کا جواب ملا یا نہیں۔

تصورات و نظریات کی تخلیق و تفہیم

مشاہدہ سائنسی تحقیق کا ایک اہم رخ ہے۔ تحقیق کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایسے تصورات (Concept) تلاش یا تخلیق کیے جائیں جن کے ذریعے مشاہدات کا مربوط فہم حاصل کیا جا سکتا ہو۔ مثلاً سیاروں کی حرکت کا تفصیلی مشاہدہ کیا گیا، جس کی تفصیلات رصد گاہوں سے دست یاب ہوتی ہیں۔ ان مشاہدات کو دیکھیں تو ان کو گرفت میں لانا مشکل کام نظر آتا ہے۔ جب بعض محققین نے تخلیقی قوت کام میں لا کر کشش ثقل (Gravitional Force) کا تصور پیش کیا تو ان سارے (بظاہر بے ترتیب) مشاہدات کو (جو اجرام فلکی سے متعلق تھے) ایک دوسرے

سائنسی تخلیق کی تکمیل محض مشاہدے سے نہیں ہوجاتی، بلکہ تصورات کی تخلیق بھی ضروری ہوتی ہے۔ باہم متعلق تصوارت کو ایک جامع نظریے (Theory) کے تحت بیان کرنا اگلا مرحلہ ہے۔ سائنسی تخلیق کا نقطۂ عروج، مختلف شعبوں میں موزوں نظریات (Theories) کی تشکیل ہے۔ ایک اچھا نظریہ، بہت سارے تصورات کو باہم جوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور گوناں گوں مشاہدات کے مربوط بیان کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اسی طرح کے موزوں نظریات، پیشین گوئی کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

سے مربوط کرنا ممکن ہوگیا اور ایک ایسا جامع بیان وجود میں آگیا جو اپنے دامن میں بہت سارے مشاہدات کو، بڑے آسان ڈھنگ سے سمیٹ لیتا ہے۔

سائنسی تخلیق کی تکمیل محض مشاہدے سے نہیں ہوجاتی، بلکہ تصورات کی تخلیق بھی ضروری ہوتی ہے۔ باہم متعلق تصوارت کو ایک جامع نظریے (Theory) کے تحت بیان کرنا اگلا مرحلہ ہے۔ سائنسی تخلیق کا نقطۂ عروج، مختلف شعبوں میں موزوں نظریات (Theories) کی تشکیل ہے۔ ایک اچھا نظریہ، بہت سارے تصورات کو باہم جوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور گوناں گوں مشاہدات کے مربوط بیان کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اسی طرح کے موزوں نظریات، پیشین گوئی کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ اگر منضبط تجربات، پیشین گوئی کی تصدیق کریں تو یہ نظریہ کے موزوں ہونے کی علامت ہیں۔

معاشی دنیا میں مشہور نظریات نے پیش رفت میں اہم رول ادا کیا ہے۔

نیوٹن کے تین مشہور قوانین، حرکت وسکون سے متعلق نظریے کی تشکیل کرتے ہیں اور موجودہ صنعتی ومشینی دور کی ٹیکنالوجی، اس نظریے کی بنا پر ممکن ہوسکی ہے۔ اشیاء کے ایٹموں پر مشتمل ہونے کے نظریے نے کیمیا اور طبعیات کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ برقی مقناطیسی قوتوں کے سلسلے میں میکسویل (Maxwell) کے نظریے نے برقی مقناطیسی لہروں کی دریافت کو ممکن بنایا ہے، جن کا استعمال لاسلکی (Wireless) کے لیے کیا گیا۔ اسی طرح کائنات کے مستقبل انفجار (Expansion) کے نظریے نے فلکیات کے مشاہدے کی تفہیم آسان کی۔

وسائل

آلات اور تجربہ گاہیں، تحقیق کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے کہ وہ پیمائش اور منضبط تجربات کو ممکن بناتی ہیں۔ آلات فراہم کرنے اور تجربہ گاہ یا رصدگاہ کو منظم کرنے کے لیے کثیر رقم درکار ہوتی ہے۔ اس رقم کی فراہمی حکومتیں کرسکتی ہیں یا نجی زمرے (Private Sector) سے متعلق وہ صنعت کار (Industrialist) کرسکتے ہیں، جو وسائل رکھتے ہوں۔ کوئی ملک، سائنس میں ترقی کرنا چاہے تو بہر حال اسے ضروری وسائل کی فراہمی پر توجہ دینی ہوگی۔

عالم اسلام کی حد تک یہ کام باہمی تعاون کا تقاضا کرتا ہے۔ کسی ایک ملک کے وسائل تک محدود رہنے کے بجائے پوری مسلم دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ اس کے لیے موجود مشترکہ فورموں کے بہتر استعمال اور نئے مشترکہ اقدامات کے آغاز کی ضرورت ہے۔ یہ طے کرنا چاہیے کہ تحقیق میں کن شعبوں اور گوشوں کو ترجیح دی جائے (تاکہ وسائل ان پر ترجیحاً خرچ کیے جاسکیں)۔ سائنس، فلسفہ سائنس، مغربی سائنس کی تاریخ اور اس کے موجودہ رخ پر تنقیدی نگاہ ڈال کر عالم اسلام کے پالیسی سازوں کو طے کرنا چاہیے کہ وہ اپنے حالات کے لحاظ سے سائنس کے کن شعبوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وسائل کا موزوں استعمال، ان شعبوں میں تحقیق کے لیے کیا جانا چاہیے۔

البتہ وسائل کی کمی، سائنسی تحقیق سے بے اعتنائی برتنے کا جواز نہیں بن سکتی۔ مشاہدہ کا وہ پہلو جو بیان (Description) سے متعلق ہے زیادہ وسائل کا تقاضا نہیں کرتا، اس پر توجہ دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح تصورات کی صورت گری (Conceptualization) کے لیے تخلیقیت اور تباہی کی ضرورت ہے۔ وسائل کی کمی کے باوجود، نظریہ سازی میں پیش رفت کی جاسکتی ہے۔

یہ مہر تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے

بنیادی اور اطلاقی سائنس

ڈاکٹر عتیق الرحمٰن

بنیادی سائنس کا تعلق معلومات کی دریافت سے ہے۔ گویا یہاں بنیادی سوال یہ نہیں ہوتا کہ دریافت شدہ معلومات کا استعمال کیسے کیا جائے؟ اس کے برعکس، سائنس کے انطباق یا اطلاقی سائنس کا تعلق دریافت شدہ معلومات کے ذریعہ نئی چیزوں کی ترتیب وایجاد سے ہے۔ اطلاقی سائنس میں پیش رفت کا انحصار ہمیشہ بنیادی سائنس کی ترقی پر ہوتا ہے۔ بنیادی سائنس میں تحقیق وتجسس ہی اصل عامل ہے جو سائنسدانوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔

اطلاقی سائنس مخصوص ومتعین سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے، جو عملی دنیا میں سامنے آئے ہوں۔ اس کے برعکس بنیادی سائنس کا مقصد کائنات میں کارفرما قوانین کو دریافت کرنا ہے۔ چاہے ان قوانین کا تعلق ایک سیل (Cell) سے ہو، مکمل حیوانی جسم سے ہو، یا پھر انواع کے پورے مجموعے (Ecosystem) سے ہو۔ سائنسداں اس طرز پر ان سوالوں پہ تحقیقی کام کرتے ہیں کہ کائنات اور اس کی اشیاء سے متعلق انسانی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔

بنیادی سائنس، سائنسی نظریات کا مربوط بیان ترتیب دیتی ہے۔ سائنسداں حقیقی اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً انسانی/حیوانی جسم میں کولیسٹرول (Cholestrol) کیسے بنتا ہے، مختلف اقسام کی بیماریاں کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ ان سوالوں کے جواب کی تلاش بنیادی ریسرچ کہلاتی ہے۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

جسم کی توانائی کس طرح سیل کی توانائی (Cellulor Energy) میں تبدیل ہوتی ہے۔

اضافی Blood Glucose Level (خون میں گلوکوز کی زیادہ مقدار) کس طرح انسانی جسم کے لیے نقصان دہ ہے۔

خلیاتی سائنس (Cell Biology)، جینیاتی سائنس، ملیکولر حیاتیاتی سائنس Physiology، Microbiology اور Virology مختلف بنیادی تحقیقی میدان ہیں۔ یہ بہت سی اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان معلومات کا استعمال انسان کی صحت یابی کے لیے ہوتا ہے۔

اطلاقی سائنس پہلے سے موجود مختلف سائنسی معلومات کا استعمال کرتی ہے۔ اس استعمال کا انحصار بنیادی تحقیق پر ہوتا ہے۔ اطلاقی سائنس، بنیادی سائنس کی تحقیق کی روشنی میں مختلف قسم کے عملی مسائل کو حل کرتی ہے۔ جیسے دوائیاں تیار کرنا۔ ان دوائیوں سے ڈاکٹر مریض کا علاج کرتا ہے، مریض کے جسم کے اندر کولیسٹرول کو کم کرنا اطلاقی سائنس کی ایک مثال ہے۔

بنیادی سائنس کے تعاون سے اطلاقی سائنس نئی نئی ٹکنالوجی کو دریافت کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ پرندوں کا ایک آشیانے سے دوسرے ٹھکانے پر ہجرت بنیادی سائنس کا موضوع ہے۔ ان معلومات سے ہوائی چکی (Wind Mill) کی ایجاد میں مدد لی گئی۔ بنیادی سائنس کی مدد سے ہوائی چکی کے ذریعے توانائی کا حصول، اطلاقی سائنس کی مثال ہے۔

تھامسن (JJ Thomsan) جس نے الیکٹران (Electron) کو دریافت کیا ہے 1916 کے ایک خطبہ میں وہ کہتے ہیں کہ:

''خالص سائنس کا مفہوم ہے وہ تحقیق، جس کے پیچھے صنعتی استعمال کا محرک کارفرما نہ ہو۔ بلکہ محض کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت کی دریافت کے لیے تحقیق کی گئی ہو۔ اس نوعیت کی تحقیق کا بھی استعمال لوگ دریافت کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال وہ ہے جو جنگِ عظیم کے دوران سامنے آئی یعنی سرجری میں ایکس رے کا استعمال۔

بنیادی سائنس کے فوائد، جنھیں چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے، حسب ذیل ہیں:

(۱) ثقافت کے فروغ میں تعاون

(۲) اقتصادی ترقی اور عملی مسائل کے حل کے لیے دریافتوں کا امکان

(۳) ضمنی فوائد (Spin Offs) اور صنعتی ارتقا

(۴) تعلیم

(۱) ثقافت کا فروغ

انسانی زندگی ترقی پزیر ہے۔ اس کی ظاہری اشکال میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ بنیادی سائنس کے سوالوں کے سلسلے میں تجسس زمانۂ قدیم سے نوعِ انسانی کی فطرت کا حصہ رہا ہے۔ انسان قدیم زمانہ سے کائنات میں کارفرما قوانین کو دریافت کرنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ نظامِ شمسی، جنیاتی عوامل، فلک کے بدلتے رنگ، یہ ایسے موضوعات کی چند مثالیں ہیں، جن سے متعلق سوالوں کے جواب کی تلاش میں نوعِ انسانی عقل کے گھوڑے دوڑاتی رہی ہے۔

جب Director of Fermilab، شکاگو کے ایک سائنسد اں Bob Wilson سے سوال کیا گیا کہ آپ کی لیب (Lab) (تجربہ گاہ) امریکی دفاعی نظام کے لیے کیا تعاون کرے گی؟

تو جواب میں Bob Wilson کہتے ہیں: ''کچھ بھی نہیں۔'' پھر فرماتے ہیں کہ یہ دفاعی نظام کو قابل اعتبار بنا دے گی۔

عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے کہ سائنسداں ثقافت کے فروغ میں تعاون کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔لیکن جب تحقیق کی راہ میں پیش رفت ہوتی ہے تو سائنسی دریافتیں اور تحقیقی عمل، ثقافت کے فروغ کا باعث بنتے ہیں۔اس بات کی شہادت سقراط کے دور میں بھی ملتی ہے۔سقراط کے دور میں یونان کا تعلیمی نظام اس فروغ کے امکان کے حق میں استدلال فراہم کرتا ہے۔

سقراط کا سوال ہے کہ ''کیا ہم مضامین کے مطالعہ میں فلکیات کے علم کو شامل کرسکتے ہیں؟''
Glaucon کہتا ہے کہ ''بنیادی سائنس کا تعلق موسموں کی تبدیلی اور ماہ و سال کے تعین سے ہے۔فوجوں کی نقل و حرکت اور کاشتکاری کی سرگرمیوں میں اس کا استعمال ممکن ہے۔''

سقراط کا قول ہے:''مجھے یہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کی خفگی سے ڈرتے ہو۔ یعنی لوگ سمجھیں گے کہ تم بے فائدہ مضامین کی تدریس کے حق میں ہو۔''

میرا خیال ہے کہ سائنسدانوں کو ثقافت کے فروغ کے لیے آگے آنا چاہیے۔اور عام رقم کا استعمال بنیادی سائنس کی ترقی کے لیے کرنا چاہیے۔جس کا تعلق ثقافتی ارتقاء سے ہو۔ بنیادی سائنس میں ثقافتی امور کے پیش نظر تحقیقات کے لیے عام لوگوں سے اپیل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ان تحقیقات کا محرک معلومات کی فراہمی، اقتصادی بہتری اور ثقافتی ارتقاء ہے۔

(۲) اقتصادی اور عملی اعتبار سے اہم دریافتوں کا امکان

بنیادی سائنس میں تحقیق اقتصادی اہمیت کی بھی حامل ہے۔اس تحقیق کے لیے مالی تعاون بہت منافع بخش ہے۔اس میدان میں ایسی راہیں بھی نکالی جاسکتی ہیں کہ وسائل کی فراہمی میں آسانیاں پیدا ہوسکیں۔شعبہ فزکس کے ماہر Cosimir اس تعلق سے بہت ہی تابناک مثالیں پیش کرتے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:

میں نے کئی دفعہ یہ بات سنی کہ تعلیمی میدان میں بنیادی تحقیق کی افادیت بہت معمولی ہے۔تاہم یہ صریح طور پر مہمل خیال ہے بنیادی تعلیم میں تعاون ہمارے لیے خوش قسمتی کی بات ہوگی۔

Transistor کی دریافت کرنے والے افراد کی تعلیم و تربیت میں Wave Theory (لہروں کے نظریے) کا کوئی رول نہیں، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا تعاون اس نظریے کے فروغ میں بہت اہم ہے۔

ایک تجزیہ نگار یہ کہہ سکتا ہے کہ جن لوگوں نے کمپیوٹر کا سرکٹ ایجاد کیا ابتداءً ان کے پیش نظر کمپیوٹر ایجاد کرنے کا ہدف نہیں تھا۔

اس کے برعکس مثال یہ ہے کہ نیوکلیائی ذرات کو دریافت کرنے والے سائنسدانوں کے پیشِ نظر نیوکلیر فزکس کے فروغ میں تعاون تھا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کے پیش نظر نیوکلیر پاور (توانائی) میں تحقیق کرنا تھا، انھوں نے صنعت کی ترقی میں رول ادا کیا۔اطلاقی سائنس کے تعاون سے نئی نئی چیزیں دریافت کیں، جن کا بڑا فائدہ صنعت کے فروغ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لیکن ان سائنسدانوں نے J.J.Thomson اور A.H.Lorentz جیسے محققین کی دریافتوں سے کوئی مدد نہیں لی۔

یہ سوال ہمارے سامنے آسکتا ہے کہ موٹر کار میں استعمال ہونے والے انڈکشن کائل نے کن مراحل سے گزر کر موجودہ صورت اختیار کی۔کیا اُس کی اختراع اُن لوگوں کا کارنامہ ہے جو تیز رفتار سواری بنانا چاہتے تھے۔کیا ایسے موجد، انڈکشن کے قوانین کو دریافت کرسکتے تھے۔واقعہ تو یہ ہے کہ مذکورہ قوانین کو فراڈے نامی سائنس داں نے موٹر گاڑی کی ایجاد سے دسیوں سال قبل ہی دریافت کرلیا تھا۔اسی طرح تاریخی ترتیب پر غور کرنے والے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا فراڈے، اپنی تحقیقات کے دوران، برقی مقناطیسی لہروں کو بھی دریافت کرسکتا تھا۔ یہاں بھی حقائق یہ بتاتے ہیں کہ فراڈے کی تحقیقات پر نصف صدی گزر جانے کے بعد، ہرٹز (Hertz) نامی محقق نے مذکورہ لہروں کو دریافت کیا۔

اس دریافت کا محرک، کوئی تمدنی ضرورت نہ تھی بلکہ Maxwell کی تشریح کے مطابق فزکس کے تصورات میں جو تناسب اور آہنگ موجود ہے اُس کے منطقی نتیجے پر Hertz نے توجہ کی۔بیسویں صدی کی سائنس میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ملے جو بنیادی سائنسی تصورات کی مرہونِ منت نہ ہو۔

کاسمیر (Casimir) نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ اس بات کا اشارہ دیتی ہیں کہ اطلاقی سائنس اور بنیادی سائنس کا باہمی تعاون اقتصادی ترقی کے لیے بہت مفید ہے۔

(۳) ضمنی فوائد (Spin-Offs) اور صنعت کو محرک کرنا: ضمنی نتائج (Spin-Offs) سے مراد ایسے آلات اور تکنیک کی ترقی ہے جو بنیادی سائنسی تحقیق سے وجود میں آئی اور رفتہ رفتہ یہ عام استعمال، صنعتی استعمال میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

(۱) WWW (ورلڈ وائڈ ویب)
(۲) ای میل
(۳) وائرلیس-مواصلات
(۴) Acceleration رفتار افروز
(۵) نیم موصل صنعت
(۶) غذائی اشیاء کا ذخیرہ، طبی استعمال
(۷) شعاعوں کا استعمال
(۸) غیر تخریبی جانچ
(۹) کینسر کا علاج وغیرہ۔

یہ کہنا درست ہے کہ ضمنی فوائد کی اہمیت کا مدار، حالات سے مطابقت پر ہے مثلاً بنیادی سائنس کے میدان میں تحقیقات پر کتنی رقم صرف ہورہی ہے اور ان آلات کی تخلیق میں فزکس کا کیا رول ہے؟ عام طور پر بھی نظر آتا ہے کہ اقتصادی ماہرین اہم ضمنی فوائد کے حصول کے لیے اہلِ صنعت کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ایسے بہت سے آلات جو جدید الیکٹرانک فیکٹریوں میں بنتے ہیں جن کی

ابتداء تعلیمی جامعات کی لیب میں ہوئی تھی۔ بہرحال سائنسی علوم کے باہمی تعاون سے بہت سے کارآمد آلات بنائے جاسکتے ہیں جن میں فزکس کے علاوہ حیاتیات، اور کیمیائی سائنس اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس سے صحت یابی اور تندرستی کی بقاء میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

بنیادی سائنس کے میدان میں سرگرم سائنسدانوں کی ہمت افزائی بھی ضروری ہے۔ اس طرح درست ترجیحات کو حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے اور تحقیق کے مضامین کو بروقت شائع کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اطلاقی سائنسداں کا ربط صنعتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ اس کی تحقیقات کا محرک، موزوں ڈیزائن کی تلاش ہے۔ اس تلاش میں سائنسدانوں کو مستقل مزاجی اور تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔

آئنسٹائن کا عام نظریہ اضافیت، مجرد نوعیت کا ہے لیکن عملی دنیا میں اس کا بھی انطباق، دریافت ہوگیا ہے۔ سب لوگ اس حیرت انگیز ایجاد سے واقف ہیں جسے GPS کہا جاتا ہے۔ یعنی ''نظامِ جہاں بینی'' جس کی مدد سے ہم زمین کے کسی بھی مقام سے موزوں راستے کا تعین کرسکتے ہیں۔ GPS کی مدد سے دیگر مفید آلات بھی بنائے جارہے ہیں اور موجود موبائل، لیپ ٹاپ وغیرہ کو زیادہ کارآمد بنانا ممکن ہے۔ GPS سے متعلق آلات کا کاروبار اربوں ڈالر کی مالیت کو پہنچ چکا ہے۔ GPS سے متعلق نظام مختلف مصنوعی سیارچوں سے آئے ہوئے سگنل کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ان سیارچوں میں ایٹمی گھڑیاں موجود ہوتی ہیں جو یہ سگنل بھیجتی ہیں۔ ان گھڑیوں کے ایجاد کے وقت ان کے اس استعمال کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہ تھا بلکہ ان کی ایجاد، نظریہ اضافیت پر تحقیق کے پیش نظر کی گئی تھی۔ آئنسٹائن نے کششِ ثقل کی تبدیلی کے ساتھ، گھڑیوں سے معلوم ہونے والے وقت کی رفتار میں تبدیلی کی جو پیشن گوئی کی تھی، اس کی صداقت جانچنا مقصود تھی۔

(۴) تعلیم:

بنیادی سائنس کے میدان میں تحقیق کا تجربہ، اطلاقی سائنس اور صنعتی ترقی کے میدانوں میں کام کے لیے طلباء وسائنسدانوں کی تربیت کرتا ہے۔ اس طرح تحقیقی اور تعلیمی میدان میں اہم تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ یہ تعلق محض صنعتی سرگرمیوں میں شرکت سے ممکن نہیں ہے۔ اقتصادیات کے ماہرین اس تعلق کی افادیت تسلیم کرتے ہیں۔ بنیادی سائنس کے شائق طلباء فلکیات اور تجرباتی فزکس (Applied Physics) کے میدان میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس حوالہ سے بنیادی سائنس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے، اور اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

کائنات کے اندر نئے نئے انکشافات مذہبی افکار کے حق میں دلائل فراہم کرتے ہیں۔ Taylor-Joesh H (فزکس میں نوبل پرائز یافتہ ۱۹۶۳) پُرکشش انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ: ''سائنسی تحقیقات کی سرگرمی ایک مذہبی تحقیقی عمل بھی ہے۔ سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں۔ کائنات کے متعلق تحقیق تصورِ خدا پر یقین میں اضافہ کرتی ہے۔''

عظیم دھماکہ Big Bang کے نظریے کی دریافت سے قبل یہ عام تصور تھا کہ کائنات میں جبریت کا قانون کارفرما ہے۔ اس کائنات کے نظم کو چلانے کے لیے، کائنات سے ماوراء کسی خدا کی حاجت نہیں۔ یہ کائنات اپنی جگہ خود مستحکم ہے۔ اس کی ساخت میں کوئی تغییر یا اضافہ ہونا ممکن نہیں۔

عظیم دھماکے Big Bang کی تائید کرنے والی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں تغیر نہ ہونے کا دعویٰ حقائق سے مطابق نہیں رکھتا۔ اس تحقیق سے کائنات یا حیات کی ابتداء کا تصور ملتا ہے۔ یہ تحقیق اس کائنات سے ماوراء ایک خدا کے وجود کے حق میں شہادت پیش کرتی ہے۔

کائنات کے بارے میں مذکورہ ماڈل کے برعکس جو تصور پیش کیا گیا وہ عظیم دھماکے کا تھا۔ اس نئے تصور کی مشاہدے نے تصدیق کی ہے۔ اس تصور کے مطابق کائنات تغیر پذیر ہے۔ اس سے کائنات کے خالق کے وجود کے لیے ناقابلِ انکار شہادت فراہم ہوتی ہے۔ جارج پولیزر جیسے مادہ پرست نے بھی اس حقیقت کو اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے۔ البتہ وہ خالق کے انکار کے لیے ''غیر محدود کائنات'' کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''کائنات کسی تخلیق کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے اس کو محض ایک لمحے میں پیدا کردیا ہوتا اور وہ یکایک عدم سے وجود میں آجاتی۔ اگر کوئی شخص تخلیق کا قائل ہے تو اسے ایک ایسے زمانے کا تصور بھی کرنا پڑے گا جب کائنات موجود نہ تھی۔ گویا ''لاشئے'' سے ''شئے'' وجود میں آگئی۔

دوسرا حیرت انگیز انکشاف حیاتیاتی سائنس کے میدان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ انکشاف بھی ایک خالق کا تصور پیش کرتا ہے۔

ایک نوع کے افراد کی نئی نسلوں تک توارثی خصوصیات کی منتقلی، ڈی این اے (DNA) کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہے۔ DNA ایک تیزاب ہے جو سیل کے مرکز میں پایا جاتا ہے۔ DNA میں چار قسم کے نائٹروجن بیس پائے جاتے ہیں۔ یعنی اڈینائن (Adenine)، گائنین (Guanine)، سائٹوسین (Cytosine)، تھائمین (Thymine)۔ مل کر یہ ایک جنیاتی کوڈ ترتیب دیتے ہیں۔ یہ کوڈ ایک خاص قسم کے امینو ایسڈ سے متعلق ہے۔ یہ بیس انگریزی زبان کے حروف تہجی سے موسوم ہوتے ہیں۔

DNA ایک نوع کے افراد کی خصوصیات کو اسی نوع کے آنے والی نسلوں تک پہنچاتا ہے۔ خصوصیات کو متعین کرنے والی معلومات کی منتقلی بہت زیادہ درست ہوتی ہے اور غلطی کے امکانات نہ کے برابر ہوتے ہیں۔ DNA میں موجود انزائم (Enzyme) Exonucleare کے ذریعہ اس غلطی کی بھی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ DNA ایک زبردست قانون کی رہنمائی کے بغیر توارثی معلومات کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے میں قاصر ہے۔

دنیا میں پائے جانے والے کسی بھی غیر جاندار نوع میں یہ قوت کارفرما نظر نہیں آتی نہ یہ غیر جاندار اشیاء کی طرح کا جنیاتی کوڈ بناتی ہیں۔ اس لیے DNA کے اندر جینیاتی کوڈ کے ذریعہ معلومات کو اگلی نسلوں تک پہنچانے کی غیر معمولی قوت وجودِ باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہے۔ بنیادی سائنس کی تحقیق کی یہ اہم مثالیں ہیں جو انسانی معلومات کو فروغ دیتی ہیں اور انسانی سماج میں سائنس کے فعال کردار کا مظہر ہیں۔

مسلم آزاد ہندوستان کے چند سائنس داں

سید عمر

ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سالم علی

قدسیہ تحسین

ڈاکٹر عبید صدیقی

ڈاکٹر احتشام حسنین

پروفیسر ای اے صدیق

ڈاکٹر شمیم جیراجپوری

ڈاکٹر سید محمود نقوی

ڈاکٹر شاہد جمیل

انیس الرحمن

آفرین علام

سائنس وٹیکنالوجی سے مسلم امت کا تعلق کافی قدیم ہے، یہ اتنا ہی پرانا تعلق ہے جتنی اس امت کی تاریخ۔ ابتداء سے ہی اس امت نے جہاں فقہ، حدیث، قرآن کے ماہرین تیار کئے ہیں وہیں طب، طبیعات، جیومیٹری، الجبراء، فلکیات، کیمیا جیسے سائنسی علوم کے بے حساب اعلیٰ پائے کے ماہرین بھی پیدا کئے۔ اندلس جسے آج اسپین کہا جاتا ہے کسی دور میں مسلم تہذیب کا ایک اہم مرکز تھا اور ساتھ ہی اسے تقریباً ہر علم کے میدان میں یوروپ کا استاد بھی مانا جاتا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ بالعموم مسلمانوں کی معاشی، سیاسی، تہذیبی، سماجی و نیز علمی و سائنسی ترقی کا سلسلہ تھم گیا ہے۔ مسلمانوں میں کوئی قابل ذکر افراد پیدا نہیں ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے شعبہ ہائے حیات میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہوں۔ اگرچہ کہ یہ بات سچ ہے کہ تقسیم ہند کے بدولت مسلمانوں کے پڑھے لکھے اور ذی شعور طبقے کا ایک بڑا حصہ سرحد کے دوسرے پار سدھار گیا تھا جس نے اس قوم کو ہندوستان میں ایک بڑا دھکا پہنچایا وہیں یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمانوں نے ان نامساعد حالات میں بھی اپنے قابلیتوں اور ذہانتوں کا لوہا منوایا ہے۔ یہ کہنا کہ ان میں کوئی قابل ذکر افراد پیدا نہیں ہوئے، یقیناً سچ نہیں ہے۔ درج ذیل سطروں میں آزاد ہندوستان میں سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں قابل ذکر کارنامے انجام دینے والے چند افراد کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فہرست اس قدر طویل ہے کہ رفیق کے صفحات ان تمام کے تعارف کے لئے ناکافی ہیں، اس لئے محض چند منتخبہ افراد کا نام ہی یہاں پر درج کئے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر اے پی جے عبد الکلام:

آزاد ہندوستان کی ٹیکنالوجی کی تاریخ ڈاکٹر کلام کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہے گی۔ تمل ناڈ کے ایک چھوٹے سے شہر رامیشورم میں پیدا ہوئے عبدالکلام کو ہندوستان کا میزائل مین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ڈی آر ڈی او اور پھر اسرو سے جڑے رہنے کے بعد ڈاکٹر کلام کا تعلق ہندوستان کے میزائل پروگرامس سے ہوگیا۔ ہندوستان کے سبھی میزائل پروگرامس میں انھوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔ ایک غریب گھرانے سے پل کر بڑھنے والے والے اے پی جے کی خدمات کے عوض انھیں ہندوستان کے اعلیٰ ترین اعزازات پدم وبھوشن اور بعد ازاں بھارت رتن سے نوازا گیا۔

اٹل بہاری واجپئی حکومت کے دوران این ڈی اے نے ڈاکٹر کلام کو اپنا صدارتی امیدوار منتخب کیا اور وہ ملک کے گیارھویں صدر منتخب ہوگئے۔ بحیثیت صدر ڈاکٹر کلام نے اپنی پہچان ایک سادہ، ایماندار اور عوامی صدر کی حیثیت سے متعارف کروائی۔ بالخصوص ان کا ویژن اور ان کی تقاریر نوجوانوں میں کافی مقبول تھے۔ علاوہ ازیں ان کی تحریریں سائنسی دنیا میں نیز نوجوانوں میں کافی مقبول تھیں۔ ان کی مشہور سوانح حیات Wings of Fire ایک مقبول کتاب ہے۔ جولائی 2015 میں اے پی جے انتقال کرگئے۔
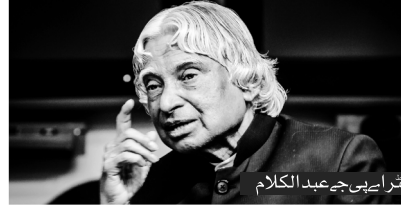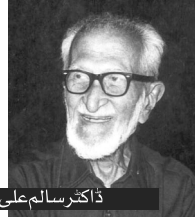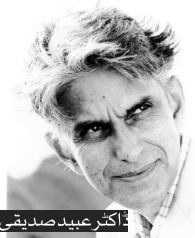
ڈاکٹر سید ظہور قاسم:

ڈاکٹر ظہور قاسم کو ہندوستان کے انٹارٹیکا مشن کے لئے جانا جاتا ہے۔ 80 کی دہائی میں ڈاکٹر قاسم نے ہندوستان کے اس طرح کے کئی مشنس کی قیادت کی۔ وہ ہندوستان کے 1981 انٹارٹیکا مشن کا حصہ تھے۔ پی وی نرسمہا راؤ کے دور میں آپ ہندوستانی پلاننگ کمیشن کے ممبر رہے۔ 89 تا 91 کے درمیان آپ نے ملک کی مشہور یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر کے ذمہ داری بھی ادا کی۔ علم سمکیات (Fisheries)، ماحولیات اور mari-culture میں آپ کی کافی خدمات رہیں۔ اپنی تحقیق کی بنیاد پر آپ نے زائد از 200 تحقیقی مقالے قومی و بین الاقوامی ریسرچ جرائد میں شائع کروائے۔ آپ کی ان خدمات کے لئے ہندوستانی حکومت نے آپ کو اعلیٰ ترین قومی اعزازات پدم بھوشن اور پدم شری سے نوازا۔ انڈین سائنس کانگریس نے 2008 میں آپ کو لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اکٹوبر 2015 میں ڈاکٹر قاسم رحلت فرما گئے۔

ڈاکٹر سالم علی:

ہندوستان کے برڈ مین (Bird Man of India) کے لقب سے جانے والے سالم معزالدین علی ماہر طیوریات تھے جنھوں نے ہندوستان میں اپنی طرز کا پہلا پرندوں کا سروے کروایا اور پرندوں کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ Bharatpur bird sanctuary نیز Silent Valley National Park۔ کے قیام وتحفظ میں ان کا رول کافی اہم رہا۔ کئی پرندے اور پرندوں پر کام کرنے والے کچھ اداروں کو آپ کا نام دیا گیا ہے۔ سالم علی کئی سائنسی اداروں کی ترقی اور مستحکم کرنے کے لئے بھی سرگرم رہے۔ اس سلسلے میں اپنی تجاویز کے ساتھ انھوں نے کئی مقالے بھی لکھے۔ ان کی خدمات کے لئے کئی اداروں اور یونیورسٹیز نے انھیں اعزازات اور ڈگریوں سے نوازا۔

ہندوستانی حکومت نے انھیں 1958 میں پدم بھوشن اور 1976 میں پدم وبھوشن سے نوازا۔ 1985 میں وہ راجیہ سبھا کے لئے بھی نامزد کئے گئے۔

ڈاکٹر عبید صدیقی:

نیورو بیالوجی اور جینیٹکس کے ماہر ڈاکٹر عبید صدیقی ہندوستان کے مایہ ناز سائنسداں تھے جنھوں نے ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈ مینٹل ریسرچ ۔نیشنل سینٹر فار بیولوجیکل سائنس کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد یونیورسٹی آف گلاسگو (امریکہ) سے انھوں نے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی ۔ University of Pennsylvania۔ میں اپنے ریسرچ کے دوران انھوں نے کافی اہم تحقیقاتی کام انجام دیئے۔ ہومی بھابھا کی دعوت پر 1962 میں انھوں نے TIFR ممبئی میں مولیکیولار بیالوجی یونٹ (Molecular Biology) قائم کیا۔ اس یونٹ کو ہندوستان میں جدید بیالوجی کی ریسرچ میں ایک انتہائی قدم مانا جاتا ہے جس نے تحقیق کے میدان میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا۔ 1980 کی دہائی میں ڈاکٹر صدیقی نے ذائقہ پر اپنا تحقیقی کام کیا جس نے جدید سائنس کو یہ سمجھنے میں مدد دی کہ ذائقہ اور سونگھنے کی حسیات دماغ میں کس طرح پہنچتی ہیں اور دماغ انھیں کس طرح سمجھ پاتا ہے۔ انھیں اپنے کام کے لئے کئی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ ہندوستانی حکومت نے بھی انھیں پدما وبھوشن اور پدما بھوشن سے نوازا۔ جولائی 2013 میں ایک سڑک حادثے کے نتیجے میں ان کا انتقال ہوگیا۔

پروفیسر ای اے صدیق:

ابراہیم علی ابوبکر صدیق ہندوستان کے مایہ ناز زرعی سائنس داں ہیں جنھوں نے اپنے کام کے ذریعے اعلیٰ معیار کی چاول کی کئی نئی اقسام کی پیداوار میں مدد دی۔ ہندوستانی حکومت نے انھیں ان کے کام کے لئے 2011 میں پدم شری سے نوازا۔ انھوں نے مختلف سائنسی اور اکیڈمک میدانوں میں کام کیا۔ ان کی تحقیق کا اصل میدان جینیٹک ریسرچ رہا جس کے ذریعے انھوں نے چاول کی کئی نئی اقسام ایجاد کی گئی۔ پوسا باسمتی 1، پوسا 21-2، پوسا 33، پوسا 4 اور پوسا 834 جیسی اقسام آپ کے نام معنون کی جاتی ہیں۔ پروفیسر صدیق نے مصر، ویتنام، بنگلہ دیش جیسے ممالک کے ساتھ ورلڈ بینک کے لئے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ورلڈ بینک کے لئے بطور صلاح کار اپنی خدمات کے دوران انھوں نے کئی پراجکٹ پروپوزلز تیار کئے۔

قدسیہ تحسین:

ڈاکٹر قدسیہ تحسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زولوجی کی پروفیسر ہیں۔ آپ ہندوستان کی دو سائنس اکیڈمیز سے وابستہ ہیں۔ Nematology۔ کے میدان میں ان کی خدمات کے لئے انھیں ONTA (Organization of Nematologists of Tropical America) کی جانب سے 2005 میں خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے والی وہ ایشیا سے پہلی خاتون ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ کئی موضوعات پر کئی ریسرچ مقالے بھی شائع کرواچکی ہیں۔ taxonomy, biodiversity, جیسے موضوعات آپ کے تحقیق کا میدان رہے ہیں۔ Nematodes کی کئی نئی اقسام اور ان کی تفصیلات پر بھی آپ نے کافی کام کیا ہے۔

ڈاکٹر شاہد جمیل:

ڈاکٹر شاہد جمیل Wellcome Trust DBT India Alliance۔ کے سی ای او اور مایہ ناز سائنسداں ہیں۔ آپ Hepatitis E وائرس پر اپنے ریسرچ کے لئے جانے جاتے ہیں۔ 2000 میں انھیں ہندوستان کے اعلیٰ ترین سائنسی ایوارڈ شانتی سوروپ بھٹناگر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین سائنسی اداروں National Academy of Sciences, India, Indian Academy of Sciences, اور Indian National Science Academy کے رکن ہیں۔ وائرس پر آپ کی تحقیقات کی ابتدا آپ کے قیام امریکہ کے دوران ہوئی جہاں انھوں نے Hepatitis B وائرس پر کام کیا ۔ اس کے بعد انھوں نے Hepatitis E اور HIV وائرس پر تحقیق کی۔ انھوں نے اس گروپ کی قیادت

بھی کی جس نے HIV-1 Type C کے لئے Vaccines تیار کئے۔ ان موضوعات پر آپ کے کئی تحقیقی مقالے نیز کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں۔

ڈاکٹر احتشام حسنین

بہار کے ضلع گیا سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر سید احتشام حسنین ملک کے جانے مانے بیالوجیکل سائنس داں ہیں جو بیوٹیک سے مربوط کئی اداروں سے جڑے ہیں اور ساتھ ہی ملک کی کئی ریاستوں میں سائنسی مشیر کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ آئی آئی ٹی دہلی میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے ڈاکٹر حسنین اس سے قبل یونیورسٹی آف حیدرآباد جیسی باوقار یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ وہ فی الوقت جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے وائس چانسلر ہیں۔ حکومت ہند نے آپ کو بیوٹیک کے میدان میں آپ کی خدمات کے لئے پدم شری سے نوازا۔ اسی کے ساتھ جرمنی نے اپنے اعلیٰ ترین شہری اعزاز Order of Merit (ہندوستان کے بھارت رتن کے مماثل) سے بھی آپ کو نوازا۔ اس اعزاز کو حاصل کرنے والے آپ واحد ہندوستانی ہیں۔ ایک سائنس داں کے علاوہ آپ کی پہچان پالیسی ساز اور ایک قابل منتظم (ایڈمینسٹریٹر) کے طور پر بھی جانی جاتی ہے۔ ہندوستانی حکومت اور کئی ریاستی حکومتوں کی سائنسی پالیسیز کے تعین میں آپ کا اہم رول رہا ہے۔ بین الاقوامی طور پر آپ ٹی بی کے ذمہ دار بیکٹیریا پر اپنی ریسرچ کے لئے جانے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر اور اسی کے ساتھ دیگر کئی موضوعات پر آپ کے سینکڑوں تحقیقی مقالے قومی اور بین الاقوامی ریسرچ جرنلز میں شائع ہوچکے ہیں۔

ڈاکٹر شمیم جے راجپوری

ڈاکٹر شمیم جئے راجپوری ہندوستان کے ایک نمایاں بیالوجیکل سائنس داں ہیں جو nematology کے میدان میں اپنی تحقیق اور کام کے لئے جانے جاتے ہیں۔ حکومت ہند کی وزارت ماحولیات کی جانب سے شروع کردہ Janaki Ammal National Award for Taxonomy سب سے پہلے آپ کو عطا کیا گیا۔ ڈاکٹر جئے راجپوری کا ایک بڑا کارنامہ ملک کی سب سے پہلی اردو یونیورسٹی (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدرآباد) کا قیام اور اور اس کے پہلے وائس چانسلر کی ذمہ داری بھی ہے۔ ملک کے کئی سائنسی اداروں کی قیادت کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہوا ہے۔ آپ کی تحقیقات کا اصل میدان درختوں اور مٹی کے nematodes رہے ہیں۔ آپ نے زائد از 20 کتابیں اور سینکڑوں ریسرچ پیپرس ان موضوعات پر تحریر کئے ہیں۔ بطور وائس چانسلر مولانا آزاد یونیورسٹی آپ نے یونیورسٹی کے قیام اور اس کے ابتدائی ایام میں استحکام کے لئے انتھک کوششیں کیں۔

آفرین علام

ہندوستانی بنیادوں سے تعلق رکھنے والی آفرین علام کی پرورش اور ان کی تعلیم امریکہ میں ہوئیں۔ بیومیڈیکل کمپنی SiNON Therapeutics کی بانی اور سی ای او 28 سالہ علام نے میڈیکل میں باضابطہ کوئی ڈگری حاصل کی اور نہ ہی وہ پی ایچ ڈی ہیں، اس کے باوجود ان کی اس میدان میں دلچسپی اور کچھ کر دکھانے کی جستجو نے ان سے وہ کام لے لیا جو کئی معمر سائنس دانوں سے ممکن نہ تھا۔ علام کی توجہ کا مرکز کاربن ڈاٹس رہے ہیں۔ کاربن ڈاٹس کافی چھوٹے ذرات (Nano Particles) کو کہا جاتا ہے جو ادویات اور علاج کے دیگر ذرائع کو لے جانے والے ذریعہ کا کام انجام دیتے ہیں۔ آئی آئی ٹی میں اپنے ریسرچ کو انھوں نے آگے بڑھایا۔ اور 15-2014 کے آس پاس انھوں نے اپنے کمپنی کی بناء ڈالی۔

ڈاکٹر سید محمود نقوی

جیولوجی کے مشہور سائنس داں سید محمود نقوی ہندوستان میں اس موضوع پر مہارت رکھنے والے چند لوگوں میں مانے جاتے تھے۔ باوقار شانتی سوروپ بھٹناگر اوارڈ یافتہ ایس ایم نقوی نے اپنے چار دہائیوں پر مشتمل کیریئر میں مختلف خدمات انجام دیں۔ جنوبی ہند آپ کے تجربات کا مقام تھا جہاں کے مختلف مقامات پر آپ نے اپنی ریسرچ کے ذریعے کئی نئی چیزیں دریافت کیں۔ 1960 کے بعد انھوں نے انتھک محنت کے ذریعے تمام وسائل سے مالا مال جیو کیمیسٹری لیبولیٹریز کے قیام کو ممکن بنایا جس نے اس میدان میں مختلف ریسیرچ کے لئے کئی ریسرچ اسکالرز کی مدد کی۔ جیوکیمسٹری کے میدان میں کئی نئے لوگوں کی تیاری کا عظیم الشان کارنامہ بھی انھوں نے انجام دیا۔ آپ نے اس میدان میں کئی ریسرچ پیپرز اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ایس ایم نقوی گولڈ میڈل آپ کے نام سے قائم کردہ اوارڈ ہے جو جیولوجی کے میدان میں قابل ذکر کارناموں کے لئے دیا جاتا ہے۔

انیس الرحمن

انیس الرحمن ہندوستانی شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے لیکن اپنی زندگی کا بڑا حصہ امریکہ میں صرف کیا اور وہیں 1987 میں ان کا انتقال ہوا۔ انیس الرحمن کو کمپیوٹنگ اپلی کیشنس میں ان کی خدمات کے لئے جانا جاتا ہے۔ آج بھی کمپیوٹرز میں لکھے جانے والے کئی Codes کی بنیاد ان کے ذریعے دئے گئے الگورتھمس ہوتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی اور بلجیم سے فزکس میں پی ایچ ڈی مکمل کیا۔ ڈاکٹر انیس الرحمن کو Molecular Dynamics کا باوا آدم کہا جاتا ہے جو کمپیوٹرز سے تعلق رکھنے والی فزکس کی ایک مخصوص شاخ ہے۔ American Physical Society کی جانب سے ہر سال فزکس میں قابل ذکر کارنامے کے لئے ہر سال انیس الرحمن اوارڈ دیا جاتا ہے۔ Computational Physics میں امریکہ میں دیا جانے والا یہ اعلیٰ ترین اعزاز ہے۔

جدید ڈیموکریسی اور موڈریٹ اسلام

ڈاکٹرسلیم خان

رفیق منزل کے گزشتہ شماروں (دسمبر ۲۰۱۷ء اور فروری ۲۰۱۸ء) میں ''جدید ڈیموکریسی اور اسلام'' کے عنوان سے قسط وار شائع شدہ مضامین کے تناظر میں یہ ایک جوابی تحریر ہے۔

میں نے سوچا اگر ڈیموکریسی کے ساتھ جدید کا اضافہ کردیا گیا ہے تو بیچارے اسلام کو کیوں تنہا چھوڑا جائے۔ یہ چونکہ ڈیموکریسی کے بنیادی تقاضے انصاف کے خلاف ہے اس لیے موڈریٹ کی اضافت تو لگادی لیکن ترجمہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکا، کہیں مولانا امین اصلاحی صاحب کی طرح مجھے بھی بودہ نہ گھوشت کردیا جائے۔ نہ جانے کیوں جوبات گھوشنا میں ہے وہ اعلان میں نہیں۔ جیسے دفع ہو جاو میں جو قوت ہے وہ نکل جاو میں نہیں۔ دلیل اگر مضبوط ہو تو نام لینے سے گریز کیا معنیٰ؟ چلیے مان لیا جمہوریت کی اصطلاح کے توسط سے ڈیموکریسی کا مطلب سمجھنے کی کوشش میں مولانا دھوکہ کھا گئے مگر ابراہم لنکن کا کیا کیا جائے کہ اس نے جمہوریت کی تعریف میں آزادی، انصاف، قانون اور رواداری وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے بجائے لفظ ''پیوپل'' کی تین بار گردان کی اور اس کے علاوہ فور، آف اور بائی جیسے حروف جار پر اکتفاء کیا۔ اب آپ پیوپل کو عوام کہیں یا جمہور کوئی خاص فرق نہیں پڑتا؟ اس طرح جمہوریت کی بابت غلط فہمی پھیلانے کا اولین فریضہ کسی اردو مترجم نے نہیں بلکہ خود ابراہیم لنکن نے ادا کردیا۔

ایتھنز کے مدبر پیرک لیز کی تقریر کے اقتباس کی بنیاد پر جمہوریت کو خوشنما بنا کر پیش کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ برطانوی پروفیسر مائیکل مین کی کتاب ''دا ڈارک سائیڈ آف ڈیموکریسی'' پر بھی نظر ڈالیں تاکہ فریب کا پردہ اٹھے۔ وہ لکھتے ہیں ''جمہوریت جہاں جاتی ہے خون، آگ، دہشت، تشدد، غنڈہ گردی کا ماحول پیدا کردیتی ہے''۔ دنیا بھر کے جمہوری ممالک میں برپا فساد اور ان کے ذریعہ دیگر ممالک میں کی جانے والی قتل وخونریزی مائیکل مین کے دعویٰ کی تائید کرتی ہے۔ ایسے بھولے بھالے لوگ بھی ہیں جو افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں جاری خونریزی کے لیے جمہوریت کے فقدان کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں لیکن ان کے پس پشت کارفرما جمہوری یوروپ اور امریکہ کی ریشہ دوانیوں سے آنکھیں موند لیتے ہیں۔ ویسے بھی مشرق وسطیٰ کی عظیم جمہوریت اسرائیل کے کارنامے کون نہیں جانتا؟ اب تو یوروپ کے لیے بھی وہ ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے۔ لیکن دنیا کی عظیم ترین جمہوریت امریکہ اسرائیل کے ہر ظلم و جبر کی پشت پناہی کررہی ہے۔ چور چور موسیرے بھائی کے مصداق عظیم ترین اور مقدس ترین جمہوریت آپس میں بغلگیر ہیں۔

یہ تو اہل علم کا ظرف ہے کہ انہوں نے ڈیموکریسی کا لفظی ترجمہ جمہوریت کردیا اگر وہ اس کا معنوی مطلب تلاش کرتے تو ان کو اصطلاحی ترجمہ منافقت کرنا پڑتا۔ ویسے ڈیموکریسی اور ہائپوکریسی ہم قافیہ بھی ہیں۔ الفاظ کے اس کھیل کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جمہوریت سے متعلق سارے فتنے فساد کا ٹھیکرا غلط ترجمے پر پھوڑا گیا۔ اس سے یہ تاثر جاتا ہے کہ جمہوریت سے اختلاف رکھنے والے سارے اردوداں انگریزی زبان سے نابلد تھے یالفظِ جمہوریت کا استعمال ان کے اظہار رائے میں بیڑی بن گیا۔ اس مفروضہ میں لپیٹ کر اگر سارے علماء کو کوڑے دان میں ڈال بھی دیا جائے تب بھی علامہ اقبال کا کیا کریں گے؟ انہوں نے جمہوریت کو اردو میں نہیں بلکہ انگریزی اور جرمنی زبان میں پڑھا۔ مخالفین سے

نہیں بلکہ علمبرداروں سے فیضیاب ہوئے۔ ہندوستان میں بیٹھ کر کتابوں پر انحصار کرنے کے بجائے یوروپ میں جا کر باقاعدہ زانوئے ادب طے کیا اور اس فتنہ کی گل افشانیوں کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ بھی کیا۔ اقبال نے جمہوریت پر تنقید کے لیے صرف اردو یا فارسی میں شاعری ہی نہیں کی بلکہ انگریزی میں خطبات بھی دیئے۔ اس لیے کم از کم جمہوریت پر علامہ اقبال کی دوٹوک نقاب کشائی پر یہ الزام نہیں صادق آتا۔

جمہوریت سے متعلق ساری گمراہی کا واحد سبب اگر اردو زبان میں ڈیموکریسی کا ترجمہ جمہوریت مان لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اخوان کے لٹریچر میں جمہوریت کی وہی تشریح کیوں نہیں ہے جو فاضل مضمون نگار نے پیش کی ہے اس لیے کہ عربوں نے دیمقراطیۃ ترجمہ کر کے اپنے آپ کو اس مصیبت سے محفوظ کر لیا جس میں ایرانیوں، ترکوں اور اردو دانوں نے گرفتار کیا۔ اخوانی لٹریچر تو ہندو پاک کی تحریک اسلامی سے زیادہ سخت موقف رکھتا ہے۔ سید قطب شہید سے بہتر جمہوریت کو کس نے سمجھا، دیکھا اور پرکھا ہے، نیز ان سے بڑی قربانی کس نے دی؟ اگر معالم فی الطریق میں وہی سب لکھا ہوتا جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے تو وہ شہادت کے رتبۂ بلند فائز نہ ہوتے۔ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کے تئیں اخوانیوں کی بیزاری، ایرانیوں اور ترکیوں سے کہیں زیادہ ہے جبکہ اس مضمون کے مطابق اردو والوں نے یہ اصطلاح فارسی وترکی زبان سے مستعار لی ہے۔

اس تشریح سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مبادہ لفظ جمہور فارسی یا ترکی زبان سے آیا ہے جبکہ جمہور کا مصدر عربی ہے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق جُمْہُور (جُم+ہُور) اصلاً عربی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں اصلی حالت اور معنی میں بطور اسم مستعمل ہے۔ اس کے معانی ہیں عوام، پبلک، سب لوگ، تمام لوگ اور سب سے آخر میں اکثریت۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۳ء میں اس کا استعمال اکثریت کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ’’بات کچھ ہوتی ہے مگر اپنی بات کی پچ میں جمہور (پبلک) کو کچھ اور جتاتے ہیں‘‘۔ اردو انسائیکلو پیڈیا میں اس کے مترادفات کے اندر اکثریت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ (مترادفات: پَبْلِک، لوگ، عَوام، جَماعَت، جَنْتا)۔ ان شواہد کی موجودگی میں یہ خیال کہ اردو والوں نے ڈیموکریسی کا ترجمہ کرنے کے لیے جمہور کو بنیاد بنا کر غلطی کی جس کے معنیٰ اکثریت کے ہیں مضحکہ خیز بات ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک خاص رویہ کا ذکر قرآن حکیم اس طرح فرماتا ہے’’ اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کیے تھے اور ان سے کہا تھا کہ‘‘ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی،‘‘ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا مگر’’ اس کے بعد جس نے تم میں سے کفر کی روش اختیار کی‘‘ یعنی انکار کیا، عہد کی پاسداری کے منکر ہوئے تو’’ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ’’ اُس نے سواء السبیل گم کر دی‘‘۔ گم گشتہ راہ ہو جانے کے نتائج کا بیان اس طرح ہوا ہے کہ’’ پھر یہ اُن کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے‘‘۔

اس کے بعد کی صورتحال نہایت دلچسپ ہے فرمایا’’ اب ان کا حال یہ ہے کہ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں،‘‘۔ یعنی کلمات کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ ڈیموکریسی، دیمقراطیہ اور جمہوریت کے درمیان لفظی بحث اس کھیل کی بہترین مثال ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۱۴ میں جہاں یہود سے خطاب کیا گیا تو آیت ۴۱ میں منافقین کے رویہ کے لیے بھی من وعن وہی الفاظ (یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ) استعمال کیے گئے ہیں اس لیے مسلمان اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ سورہ مائدہ کی ۴۱ ویں آیت ایسے دعویدارانِ اسلام کو یہود کا ہم مجلس یا جاسوس قرار دیتی ہے۔ بنی اسرائیل کے اس رویہ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ ’’ جو تعلیم انہیں دی گئی تھی اُس کا بڑا حصہ بھول چکے ہیں، اور آئے دن تمہیں ان کی کسی نہ کسی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے ان میں سے بہت کم لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں لہٰذا انہیں معاف کرو اور ان کی حرکات سے چشم پوشی کرتے رہو، اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش رکھتے ہیں‘‘۔ اس آیت کے حوالے سے الزام تراشی مقصود نہیں ہے، مرعوبیت کے سبب یہ ہوسکتا ہے۔

عصر حاضر کے روشن خیال مسلمانوں نے تحریف کلمات کے تحت موڈریٹ اسلام ایجاد کیا تاکہ باغباں کے ساتھ صیاد کو بھی خوش رکھا جاسکے۔ پرویز مشرف اور عبدالفتاح السیسی جیسے نام نہاد مجددین نے اسلام کو مغربی الحاد کے قالب میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی تاکہ غلام عوام بہلتے رہیں اور مغربی آقا کی خوشنودی بھی حاصل رہے مگر نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ ویسے مغربی آقا راضی ہوتے بھی کیسے فرمان خداوندی جو ہے’’ تم ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ، ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں، اور نہ تمہارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے، اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا‘‘۔ اس آیت میں اہل ایمان کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔

باطل کو موڈریٹ بنا کر مسلمانوں کے گلے سے نیچے اتارنے کی سعی اسلام کو موڈریٹ بنا کر مغرب کے لیے قابلِ قبول بنانے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ کوشش متضاد باتیں کہلواتی ہے۔ مثلاً ’جمہور کے معنیٰ اکثریت کے نہیں ہیں‘ لیکن یہ’ اس کی ناگزیر عملی صورت ہے‘۔ اس کے باوجود وہ’ اکثریت کی حکومت نہیں ہے‘۔ انسان بھول جاتا ہے کہ ڈیموکریسی کی اولین خصوصیت یہ بیان کر چکا ہے کہ’’ جماعت کے ہاتھ میں حکومت ہے‘‘ جماعت بہرحال جملہ عوام نہیں بلکہ اس کا ایک مخصوص گروہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی جماعت ہے جس کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہوتی ہے تو اس کا جواب ہے اکثریتی جماعت یعنی اگر اس کو اقلیت کی حمایت حاصل ہو تب بھی یہ دوسروں کے مقابلے یہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔

عوام کی حاکمیت کو ڈیموکریسی کا اصل نہیں بلکہ جعلی مغربی تصور کہنا کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ جمہوریت ایک مغربی تصورِ حیات ہے اور اس کے معنیٰ و مفہوم بیان کرنے کا حق اس کے موجدین کو ہے۔ کسی غیر کا اس میں اپنے من پسند معنیٰ گھسیڑنا اور بزعمِ خود اصلی اور جعلی کا فیصلہ کرنے لگ جانا سراسر زیادتی ہے۔ مغرب کے مستشرقین دین اسلام کے ساتھ تو یہ کھلواڑ کرتے رہتے ہیں لیکن اسلامی اخلاقیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ نیا فلسفہ ایجاد کرنے کی آزادی سبھی کو ہے لیکن کسی موجود نظریہ سے خلط مبحث کر کے کنفیوژن کھڑا کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے توحید کا اسلامی تصور مشرق وسطیٰ کا نہیں ہے بلکہ وہ مجبوراً کسی سبب سے اختیار کر لیا گیا۔ اصل توحید تو وحدت الوجود ہے یا نبوت وہ نہیں ہے جو مشرق وسطیٰ کے لوگ پیش کرتے اور دنیا بھر کے مسلمان قبول کرتے ہیں بلکہ رسالت کا حقیقی تصور تو ہندوستان میں رائج اوتارواد ہے۔

جمہوریت محض ایک انتخابی طریقۂ کار یا سیاسی نظام نہیں بلکہ مغرب کے ملحدانہ نظامِ حیات کا ایک اہم ترین رکن ہے۔ مثلاً اسلام میں ہم شہادت دیتے ہیں کہ کوئی الٰہ نہیں یعنی (سارے معبودانِ باطل بشمول نفس اور جمہور کا انکار) مگر اللہ۔ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ یعنی اللہ وہ معبود حقیقی اور حاکم اعلیٰ ہے جس کی عبادت واطاعت کی جائے۔ یہ کام کتاب اللہ کی روشنی میں نبیؐ کی اتباع سے ہی ممکن ہے۔ مغرب کا الحادی سب سے پہلے لادینیت کی بنیاد پر سارے ادیان کو اجتماعی زندگی سے نکال باہر کرتا ہے۔ اس کے بعد نفس کو معبود حقیقی قرار دیتا ہے اور ایک خود ساختہ مشکل میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ انسان اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اس لیے جب یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اجتماعی معاملات کیسے طے ہوں تو اس کے لیے جمہوریت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ الہامی ہدایت سے انکار کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ عوام کی مرضی سے حق و باطل اور حرام و حلال کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ سواء السبیل کو گنوانے کا فطری تقاضہ ہے۔ جس طرح رسالت دین اسلام کا جزو لاینفک ہے اسی طرح جمہوریت بھی مغرب کے ملحدانہ نظام حیات کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس کو زبردستی اسلام سے نتھی کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری ہے۔ ایسا کرنے سے دونوں متحارب نظامہائے حیات کے چہرے مسخ ہو جاتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ڈیموکریسی کو کسی طور مغرب سے الگ کر کے مسلمان بنانے کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی؟

دراصل عصر حاضر میں یہ غلط فہمی پھیلا دی گئی ہے کہ عوام کی رائے لینے کے لیے ڈیموکریسی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے حالانکہ اسلام کی شورائیت میں اس کی بھرپور گنجائش بلکہ یہ پسندیدہ ہے۔ اسلامی حکومت اگر ہر چار یا پانچ سال میں ایک بار عوام سے یہ پوچھے کہ زمامِ کار کس کے ہاتھ میں ہونی چاہیے اور ان کے نمائندے کون ہوں گے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جمہوریت نواز بھی یہی کرتے ہیں کہ چار یا پانچ سال میں ایک بار پوچھ لینے کے بعد درمیان میں عوام سے شاذ و نادر ہی کوئی مشورہ کرتے ہیں نیز مشاورتی کاونسل میں بھی کئی ایسے لوگوں کو شامل کر لیا جاتا ہے جن کو عوام مسترد کر چکے ہوتے ہیں۔ ایسے بہت سارے لوگ جو عوام کے احساسات وجذبات کے ترجمان ہوتے محض اس لیے نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ صدر یا وزیر اعظم کے لیے خطرہ یا اسے ناپسند ہوتے ہیں۔ معیارِ حق کی عدم موجودگی میں حکمرانوں پر لگام لگانے کی کوششیں عام طور پر بے سود ہو جاتی ہیں، مگر اسلام کا شورائی نظام ان عیوب سے پاک ہے اور اس لیے کسی آمیزش کا محتاج نہیں ہے۔

جمہوریت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کوئی نزع پیدا ہو جائے مثلاً ہم جنسی قانوناً جائز ہو یا نہ ہو؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے حال میں آسٹریلیا کے اندر استصواب کیا گیا اور اسے حلال کر لیا گیا کیونکہ عوام کی حکومت، جو عوام کے ذریعہ اور عوام کے لیے چلائی جارہی ہو اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ امریکہ کی حالت اور بھی دلچسپ ہے۔ وہاں کے لوگ بے شمار ناجائز تعلقات رکھ سکتے ہیں۔ جمہوری نظام اس کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اسے فروغ دیتا ہے اس لیے کہ یہ پیرک لیز کی بیان کردہ روحِ جمہوریت 'آزادی' کا تقاضہ ہے نیز سب کو عیاشی کے 'یکساں مواقع' فراہم کرنے کا ضامن بھی ہے۔ وہاں پر لوگ اپنی ہی جنس کے

امریکہ سے فرانس آئیں جس کا شمار یوروپ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں میں ہوتا ہے۔ یہاں بے لباسی تک کی اجازت ہے مگر حجاب ممنوع ہے۔ حجاب تو ایک انفرادی عمل ہے لیکن جب کوئی خاتون 'اخلاق کی پاسداری' کرتے ہوئے اس پر عمل کرتی ہے تو جمہوری قبامیں پائے کوب دیو استبداد رونما ہو کر ساری 'رواداری' کو نگل جاتا ہے۔ اس 'مظلوم کی حمایت' میں کوئی آگے نہیں آتا۔ 'قانون کی بالادستی' اس سے جرمانہ وصول کرتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت خود اپنے گربھ گرہ میں ایتھنز کے سب سے بڑے مدبر پیرک لیز کی بیان کردہ ایک ایک قدر کو پامال کرتا ہے۔

لوگوں سے شادی بھی کر سکتے ہیں اس لیے کہ ’قانون کے سامنے سب کی مساوی حیثیت‘ ہے (جیسے مرد ویسی عورت) لیکن تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اہل مغرب کے خیال میں ایسا کرنا خواتین کے حقوق کی پامالی ہے یعنی ایک سے زائد جتنی عورتوں سے چاہو ناجائز تعلق رکھو لیکن چار کی تحدید کے ساتھ بھی ایک سے زائد کو اپنے نکاح میں نہ لو۔

جمہوری نظام میں اس کو بے راہ روی کو روکنے کی واحد سبیل عوام کی تائید یعنی استصواب۔ کیا یہ عوام کی حاکمیت نہیں ہے؟ اور تو اور بار بار ہونے والی گولی باری کے باوجود گن لابی کے دباو میں، اس پر پابندی کے لیے استصواب تک نہیں کرایا جاتا اور بے قصور لوگوں کو مرنے دیا جاتا ہے۔ امریکہ سے فرانس آئیں جس کا شمار یوروپ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں میں ہوتا ہے۔ یہاں بے لباسی تک کی اجازت ہے مگر حجاب ممنوع ہے۔ حجاب تو ایک انفرادی عمل ہے لیکن جب کوئی خاتون ’اخلاق کی پاسداری‘ کرتے ہوئے اس پر عمل کرتی ہے تو جمہوری قبا میں پائے کوب دیو استبداد رونما ہو کر ساری ’رواداری‘ کو نگل جاتا ہے۔ اس ’مظلوم کی حمایت‘ میں کوئی آگے نہیں آتا۔ ’قانون کی بالادستی‘ اس سے جرمانہ وصول کرتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت خود اپنے گربھ گرہ میں ایتھنز کے سب سے بڑے مدبر پیریک لیز کی بیان کردہ ایک ایک قدر کو پامال کرتا ہے۔

امت کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ملت اسلامیہ کا فرض منصبی کتاب وسنت کے مطابق انبیائی مشن کی تکمیل میں سرگرم عمل رہنا ہے۔ اس عظیم مقصد کا حصول من مانے طریقہ پر ممکن نہیں ہے۔ کتاب الٰہی کی روشنی میں اس فرض کی ادائیگی لازم ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ”ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے“۔ اللہ کی یہ کتاب نبی کریمؐ کے توسط سے مومنین کے پاس امانت ہے۔ اس کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ ”لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو“۔ یہ آیت اہل ایمان کو یاد دلاتی ہے کہ اپنے معاملات کا غیروں سے فیصلہ کرانا انہیں زیب نہیں دیتا۔ ان کا مقام و منصب تو یہ ہے نہ صرف اپنے مسائل وقضیات وہ کتاب الٰہی کی روشنی میں چکائیں بلکہ دوسرے بھی اپنے معاملات کو لے کر ان سے رجوع کریں۔ ملک و سماج میں اپنی اس حیثیت کو منوانا امت کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ یہ مقامِ سعادت داخلی و خارجی خطرات سے گھرا ہوا ہے اس لیے پہلے ہی مرحلے میں تنبیہ کردی گئی کہ اس پر فائز ہونے کے بعد ہدایت الٰہی سے منہ موڑ کر غیروں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنے لگنا۔

کائنات ہستی میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق دین و نظریہ اختیار کرسکتا ہے اور ان تمام مذاہب و نظریات کے ماننے والوں کی شریعت اور راہ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس حقیقت کا اظہار آیت کے اگلے حصے میں یوں کیا گیا کہ ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی اگرچہ تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا“۔ خالق کائنات کی عطا کردہ آزادی آزمائش کے پیش نظر فرمایا ”لیکن اُس نے یہ اِس لیے کیا کہ جو کچھ اُس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے“۔ چھوٹ تو اس لیے دی گئی کہ جبر کے ساتھ آزمائش ممکن نہیں لیکن مسابقت کے لیے راہِ فلاح کی بھی نشاندہی کردی گئی فرمایا ”لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو“۔ ایسے میں اگر کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ میں برائی کے بجائے بھلائی کا راستہ کیوں اختیار کروں؟ اور اس سے کیا فرق پڑے گا؟ تو ان لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ دیکھو ”آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتادے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو“۔ اس آیت سے واضح ہے کہ مختلف ادیان و نظریات کے ماننے والوں کی راہیں جدا جدا ہیں۔ اپنی انتہائی منزل یعنی بارگاہِ خداوندی میں حاضری کے بعد سب کا انجام یکساں نہیں ہوگا۔

سورہ مائدہ کی مندرجہ بالا آیت کے فوراً بعد دوبارہ اسی بات کا اعادہ کہ ”اور ہم نے تمہیں حکم دیا کہ جو کچھ اللہ نے تم پر نازل کیا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو“ اس حقیقت کی نشاندہی ہے کہ خطرات اندر اور باہر دونوں جگہ ہوتے ہیں۔ طاغوتی عناصر اہل ایمان کو اپنی خواہشات کا غلام بنانا چاہتے ہیں اسی لیے خبردار کرتے ہوئے فرمایا گیا ”نیز ان کی طرف سے ہوشیار ہو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے کسی حکم سے تمہیں ڈگمگا دیں“۔ عہدِ جدید کے طاغوت کو اندازہ ہوگیا ہے کہ اہل ایمان کو بزور قوت اپنے دین سے برگشتہ کرنا مشکل ہے اس لیے عصر حاضر میں باطل کے علمبردار اپنے ادیان و نظریات کو نہایت خوشنما بنا کر پیش کررہے ہیں۔ ایسے میں اچھے خاصے مسلمان اس کے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ ہم سب کو اس فتنے سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

فریب خوردہ لوگوں کا عبرتناک انجام آگے اس طرح پیش کیا گیا کہ ”پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو اللہ کو یہی منظور ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر مصیبت پڑے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں سے بہت سے لوگ نافرمان ہیں“۔ موجودہ حالات میں ایسا لگتا ہے کہ یہ آیت ابھی ابھی نازل ہورہی ہے۔ کس بے خوفی کے ساتھ امت اپنے گناہوں کی پاداش میں اللہ کی جانب سے آنے والی مصیبتوں کو دعوت دے رہی ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ اس سلسلے کی تیسری اور آخری آیت کے اندر انذار کا سمندر ہے۔ اللہ کے قانون سے منہ موڑنے والوں سے کتاب الٰہی ایک رونگٹے کھڑا کرنے والا سوال کرتی ہے ”تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟“۔ اس سوال سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ کون ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرسکتا ہے کہ ہاں میں جاہلیت کو اسلام پر ترجیح دیتا ہوں لیکن جمہوریت یا ڈیموکریسی بھی جاہلیت ہی کی ایک شکل ہے۔ اہل ایمان کی قلبی کیفیت پر آیت اختتام پذیر ہوتی ہے ”اور یقین رکھنے والی قوم کے لیے حکم (دینے) میں اللہ سے بہتر کون ہوسکتا ہے“۔ ■

سوشل میڈیا اور سیلفی کلچر کے خطرات

شاداب موسیٰ

آج کی جدید اور ٹکنالوجی کے میدان میں تیزی سے ترقی کرنے والی دنیا میں، یہ سیکھنے میں اچھا خاصا وقت صرف کیا جاتا ہے کہ ہمارے زندگی کے ہر پہلو میں کارکردگی کو بہتر بنانے اور اس میں اضافہ کے لئے موجودہ ڈیجیٹل نظام کو کس طرح بہتر سے بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔ کریئر کے حوالے سے آجرین (Employers) تکنیکی مہارت (Technical Proficiency) کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کارگاہ (workplace) کی لیاقت (efficiency) بڑھانے کیلئے موجودہ چیزوں کے گھ جوڑ سے نئے سسٹم کی سمت پیش قدمی کرتے، اس سکڑتے جا رہے جاب مارکٹ میں جو افراد اس ڈیجیٹل سیلاب کا ساتھ دینے میں ناکام ہو جاتے ہیں، اپنی مسابقت و اہمیت کھو دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا اور لوگوں کو جوڑنے والے آلات (networking tools) میں جدت (Innovation) نے جہاں ہمارے دوستوں اور خاندان سے بات چیت کیلئے درمیان کی تمام رکاوٹیں دور کردی ہیں، وہیں ہماری سماجی زندگیوں کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے پاس موجود نئے آلات (devices) کی وجہ سے ہمارے ذہن ہمیشہ بھٹکے رہتے ہیں کیونکہ ہم آنے والے اپ ڈیٹس، تبدیلیوں اور ڈھیر ساری معلومات کے بوجھ سے ہمیشہ الجھے رہتے ہیں، جو کبھی ختم ہوتے محسوس نہیں ہوتے۔ ہماری تمام حسیات ہر جانب سے ہمیشہ متحرک رہتی ہیں اور خاموشی و سکون کا ایک لمحہ ملنا بھی ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں اپنی ذات کے بارے میں سوچنے اور غور و فکر کرنے کیلئے وقت نہیں مل پاتا۔ ہم کیسا سوچتے اور محسوس کرتے ہیں، اس کو قریب سے دیکھنے کے بعد ہی ہم اپنے ذہنی ڈھانچے یا خیالات کے خاکے کو بدلنے کی قابلیت حاصل کر پاتے ہیں، جو ہمارے لئے مفید ہوتا ہے۔ ہمارے روحانی پہلو کے ساتھ سب سے گہرا تعلق ہمارے خیالات کا ہوتا ہے۔ ایسا اسلئے کیونکہ خیالات طبعی دنیا سے پرے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ حالانکہ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک شخص خیالات میں مگن ہے، مگر وہ خیالات کیا ہیں یہ ہم نہیں جان سکتے۔ اللہ کے سوا ان خیالات سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کیلئے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے، ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ خیالات کس طرح مختلف مراحل سے گزر کر افعال بنتے ہیں۔

''اپنے خیالات کی حفاظت کریں؛ وہ الفاظ بن جاتے ہیں۔ اپنے الفاظ پر توجہ دیں؛ وہ اعمال بن جاتے ہیں۔ اپنے اعمال کی نگرانی کریں؛ وہ عادات بن جاتے ہیں۔ اپنی عادات کو دیکھتے رہیں، وہ آپ کا کردار بن جاتی ہیں۔ اپنے کردار پر نظر رکھیں؛ یہ آپ کی تقدیر بن جاتا ہے۔'' فرینک اوٹلا

سوشل میڈیا کے کلچر نے ایک فرد کو اپنی ذات اور اپنے خیالات کو پیش کرنے کے زبردست مواقع فراہم کر دیئے ہیں۔ آپ کیا سوچتے ہیں اور کیا کھاتے، پیتے اور پہنتے ہیں وغیرہ سے لیکر آپ کیسے دکھتے ہیں (مختلف اپلیکیشنز کی مدد سے جو ایک فرد کو دلکش اور خوبصورت بنا کر پیش کرتی ہیں)، اور یہ نشہ آور ہے۔ فرد کو یہ احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ کب اور کیسے اپنی ہی ذات کے نشہ میں گھر گیا ہے۔ یہ ہمیں بگاڑ دیتا ہے اور یہ خصوصاً فرد کی غلط تصویر اور عموماً زندگی کی غلط تشریح کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ہمیں بڑائی اور گھمنڈ میں مبتلا کرتا ہے حالانکہ ہم اسکے حقدار نہیں ہوتے۔ اور پھر فرد بڑائی کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتا ہے۔ یہ فرد کو دینے کی بجائے صرف لینے کیلئے تیار کرتا ہے۔ یہ کاموں سے متعلق سنجیدگی کو تباہ و برباد کرتا ہے اور فرد کا رخ خودنمائی کی طرف موڑ دیتا ہے۔ پھر فرد کی دلچسپی کا محور اسکی اپنی ذات بن جاتی ہے اور وہ باہمی تعاون کی اہمیت اور ضرورت سے ناآشنا رہتا ہے۔ اسکے نتیجے میں کچھ لوگ اپنے آپ کو بہت مخلص بنا کر پیش کر سکتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ہر دلعزیز بن بھی جائیں تاکہ دوسروں پر غالب ہونے کے مواقع حاصل کر سکیں، لیکن اگر انہیں معمولی کاموں میں عام افراد کی طرح تعاون کرنے کیلئے کہا جائے تو وہ بالکل کنارہ اختیار کر لیں گے۔ یہ ہے جو سوشل میڈیا کلچر ہم میں بھر دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے خیالات اور دماغ کو اس بات کی تربیت دینا ہوگی کہ اپنی ذات پر مسلسل گہری نظر رکھی جائے۔

اسلام کا مراقبہ کا تصور ہماری زندگیوں کو نظم و ضبط فراہم کرنے کیلئے ہمارے اذہان کی تربیت میں مدد کر سکتا ہے اور اس طرح ہماری عبادات اور روزمرہ کی سرگرمیوں کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اس بات پر ایمان کہ اللہ ہمیں ہر آن دیکھ رہا ہے، مراقبہ کی بنیاد ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنے افعال، خیالات، جذبات اور دیگر اندرونی حالتوں کے بارے میں زیادہ متوجہ اور چوکنے رہتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرتے رہو'' (البقرہ: ۲۳۵)

خود شناسی اور خود پرستی کے درمیان بالکل خفیف سا فرق ہے۔ ابلیس اس کی بہترین مثال ہے، وہ خود پرستی میں اتنا بہہ گیا کہ غرور، تکبر، شیخی اور فخر میں مبتلا ہو کر رہا۔

ابن القیم اور الغزالی دونوں کی کتابوں میں مراقبہ کے فائدے اور حقائق سے متعلق باب موجود ہے۔ اور یہ محض کوئی تجویز کردہ وصف نہیں ہے بلکہ یہ اعلیٰ ترین روحانی مقام (احسان) کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث جبرئیل میں اللہ کے رسولؐ نے روحانیت کے اعلیٰ ترین مقام کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ''اللہ کی عبادت اس طرح کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، یا اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ ضرور تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' بالفاظ دیگر، روحانیت کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ آپ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ اللہ حاضر و ناظر ہے۔ یہ ایمان کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

کوئی تعجب کی بات نہیں کہ قرآن سوچنے اور غور و فکر کرنے کے روحانی عمل پر بہت زور دیتا ہے۔ قریباً ۷۵۰ مقامات پر قرآن سوچنے و غور و فکر کرنے، اپنا احتساب کرنے، سننے اور دیکھنے پر اکساتا ہے۔ اسلامی روایات میں اکثر بیان کیا جانے والا مراتب القصد (ارادہ کے مراحل) کا ماڈل انسانی رویے کا ایک مکمل روحانی خاکہ فراہم کرتا ہے جو خیالات سے شروع ہو کر جذبات یا ارادہ سے گزرتا ہوا افعال پر ختم ہوتا ہے۔ پانچوں مراحل کی ترتیب اس طرح ہے۔

۱۔ **الھاجس:** ایک مختصر خیال جو فوراً آتا ہے اور فوراً چلا جاتا ہے۔

۲۔ **الخاطر:** وہ خیال جو ذہن میں آتا ہے اور فرد اس کے بارے میں سوچنے کا تہیہ کرتا ہے۔

۳۔ **حدیث النفس:** ایک اندرونی گفتگو، جس میں خیال کے اوپر پوری توجہ سے غور کیا جاتا ہے۔

۴۔ **الھم:** ایک ارادہ کا مقام یا جذباتی حالت، جس میں سوچنے کا عمل ارادہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۵۔ **العزم:** کسی کام کو کرنے کا مضبوط ارادہ۔ کوئی فرد 'ھم' کے مرحلے پر تو کسی کام کیلئے ہچکچاہٹ میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن 'عزم' کے مقام پر پہنچنے کے بعد ارادہ بالکل مضبوط ہوتا ہے۔

ارادہ کے مراحل عام طور پر اس نظم کے حوالے سے بیان کیے جاتے ہیں۔

مراتب القصد خمس هاجس ذكروا
فخاطر فحديث النفس فاستمعا
يليه هم فعزم كلها رفعت
سوى الاخير ففيه الاخذ قدوقعا

یہ قطعہ مشہور قرآنی مفسر آلوسیؒ (وفات ۱۲۷۰ھ) نے روح المعانی میں درج کیا ہے۔

تزکیہ نفس کا پورا تصور انسانی خواہشات اور جبلتوں کو دیگر اعلیٰ صفات کے ذریعے قابو میں رکھنے کے گرد گھومتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ایک فرد اپنے آپ کو پہچانے کہ وہ کون ہے؟ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پالیا اس نے اپنے رب کو پالیا)۔ یہ مشہور جملہ خود شناسی کی اصل کو آشکار کرتا ہے۔ خود شناسی اپنے خدا کو پہچاننے کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ لیکن خود شناسی اور خود پرستی کے درمیان بالکل خفیف سا فرق ہے۔ ابلیس اس کی بہترین مثال ہے، وہ خود پرستی میں اتنا بہہ گیا کہ غرور، تکبر، شیخی اور فخر میں مبتلا ہو کر رہا۔ جو ٹھہری کفر/شرک کی بدترین شکلیں!

اسلام ایک مسلمان سے یہ چاہتا ہے کہ اس کی نیت خالص اللہ کے لیے ہو اور یہ مشکل ترین کام ہے۔ اس مقام کو پہنچنے کے لیے خود پر زبردست قابو اور خیالات و افعال کے حدود کی رکھوالی درکار ہوتی ہے۔ یہ شرک کی بدترین شکل ہے کہ ہم اپنے نفس کی بندگی شروع کر دیں۔ عزت ہو یا ذلت، سب اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اور ہمارے خیالات و اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم نام، شہرت اور مقبولیت کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیں تو اللہ سے متعلق ہماری سنجیدگی کو سنگین خطرہ میں ڈال رہے ہیں اور بدترین انجام کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ اس آیت میں واضح طور پر بیان ہوا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران۔ ۲۶)

ابراہیمؑ کی سیرت میں اسکی بہترین مثال ملتی ہے۔ سورہ بقرہ (آیت ۱۲۷) ہمیں وہ منظر دکھاتی ہے جب وہ اسمٰعیلؑ کے ساتھ کعبہ کی دیوار اٹھاتے ہوئے دعا کرتے جا رہے تھے کہ اے اللہ اس خدمت کو قبول فرما لے۔ آیت میں جو عربی لفظ استعمال ہوا ہے وہ ''تقبّل'' ہے جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا اصل مطلب ہے 'اے اللہ اسے مکمل طور پر قبول فرما لے۔ پیغام ہمارے لیے واضح ہے، کوئی بھی کام جو ہم انجام دیتے ہیں وہ کامل نہیں ہوتا، ہم کامل نہیں ہیں۔ لیکن معاملہ جیسا بھی ہو، اللہ قبول فرماتا ہے۔ ابراہیمؑ ساری دنیا کے امام بنائے گئے۔ قرآن کے مطابق ابراہیمؑ وہ شخص تھے جنہوں نے اللہ کی طرف سے کی گئی ہر آزمائش کو ممکنہ کاملیت کے ساتھ پورا کیا۔ جس خوبصورت انداز اور عاجزی کے ساتھ ابراہیمؑ نے اپنا یہ عظیم کام اللہ کی خدمت میں پیش کیا وہ ہمیں اپنے معمولی کاموں اور خدمات کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ سکھاتا ہے۔

سوشل میڈیا اور سیلفی کلچر ایک چھوٹے اور معمولی سے کام کو بھی بہت بڑا اور ہماری ذات کو سب سے اہم بنا کر پیش کرتا ہے۔ بھلے ہی ہم سب کے سامنے اتنے فخر سے یہ نا کہہ سکیں، لیکن ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے ''میں تو اتنا عظیم اسلامی کام کر رہا ہوں۔'' لیکن ہمیں کیسے پتہ چلے؟ اور تب ہم دیگر لوگوں اور ان کی کوششوں کو نیچی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو پورے اطمینان کے ساتھ اس کا مستحق سمجھتے ہیں۔ یہ گویا اس طرح ہے، ''دین کی خدمت کرنا لیکن اپنی انا کی بندگی کرنا۔''

ادارے کا تعارف

EFLU انگلش

اینڈ فارن لنگویجیز یونیورسٹی

ریاض الحق، اے ایم یو، علی گڑھ

آزاد ہند کے ابتدائی ایام میں معیشت وسیاست کا یہ فوری تقاضا تھا کہ عوام اور حکومت کے ربط وضبط بیرونی ممالک سے سطحی اور حکومتی طور پر استوار ہوں مزید یہ کہ برسوں کی روایت پرستانہ روش پر قدغن لگایا جائے اور عوام کو دنیا کے رنگ وڈھنگ سے آشنائی دلائی جائے۔ عہد رواں کے ان مطالبات کی تکمیل اس لئے بھی ضروری تھی کہ ملک زمانے کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے ترقی کی منازل بآسانی اور بحسن خوبی طے کر سکے۔ علاوہ ازیں ہمارے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ خواب تھا کہ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں آئے جو نہ صرف طلبہ کو اعلی ومعیاری تعلیم سے ہمکنار کرے اور انہیں غیر ملکی زبانوں سے متعارف کرے بلکہ مدرسین کو بھی درس وتدریس کی اعلی تربیت مہیا کرائے۔

اسی خواب کو شرمندہ تعبیر کرتے ہوئے جنوبی ہند کے مشہور ومعروف شہر حیدرآباد میں اپنی قسم کے پہلے تعلیمی مرکز، انگلش اینڈ فارن لنگویجیز یونیورسٹی EFLU کی بنیاد رکھی گئی جو کہ انگریزی اور دیگر غیر ملکی زبانوں کی درس وتدریس کے لیے وقف ہے اور درس وتدریس، ادب ولسانیات، بین المضامین اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں مختلف زبانوں کی اعلی ومعیاری تعلیم وریاضت اور تحقیق و مطالعہ کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ افلو (EFLU) کے قیام کا واحد مقصد مختلف زبانوں میں اہلیت واستعداد پیدا کرنا اور فن تدریس، مشق وتربیت کو پروان چڑھانا ہے۔ یونیورسٹی کا منشور اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ یونیورسٹی انگریزی ودیگر زبانوں کی تعلیم میں جدید طرز تدریس وتحقیق کو ترقی دے گا اور تشہیر وترغیب کے فرائض انجام دے گا مزید اس میدان میں سہولت فراہم کرنے کی خاطر ہر واجب ضرورت کی حتی المقدور تکمیل کرے گا۔ اسی طرح ادبی وثقافتی میدان میں تہذیبوں کی بین الثقافتی تنقیدی فہم کو پروان چڑھانا بھی اس کے لائحہ عمل میں شامل ہے۔

اس نے مدرسین کا انتظام تین سطحوں (ابتدائی سے سوائی) میں ملک بھر میں کیا ہے اور غیر ملکی باشندوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام CIEFL EFLU/ میں کیا ہے۔ EFLU نے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے خواب کو عملی جامہ پہنایا جو کہ ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جس کے ذریعے طلبہ کے علاوہ اساتذہ کو بھی انگریزی زبان وادب کی اعلی درجہ کی تربیت مہیا کی جاسکے۔ EFLU نے اپنی مختلف مجلس مشاورت، تجدیدی نصاب اور تخلیقی طرز تدریس کے ذریعہ باضابطہ ٹیچرس تربیتی پروگرام کے انعقاد کا قابل رشک معیار طے کیا ہے۔ موجودہ وقت میں ادارہ نے علاقائی نسبت سے انگریزی تعلیم کا بھی آغاز کیا ہے جس کے لیے ادارہ درسی کتابیں مہیا کراتا ہے اور دوسرے تکنیکی ذرائع بھی فراہم کرتا ہے۔

وقتاً فوقتاً ادارہ اپنے اہداف ومقاصد کے دائرہ کو وسعت بخشتا رہتا ہے مثلاً انگریزی تعلیم کے معیار کو مزید بہتر بنانا، موزوں ومناسب تحقیقات کی ذمہ داری لینا غیر ملکی زبانوں کے مواد جمع کرنا اور اس کی اشاعت کرنا مختلف اچھوتے اور پچھڑے علاقوں میں درسیات کی فراہمی وارتقاء، تقویم وتشخیص کے پیمانے اور اصولیاتی تحقیقات وغیرہ ادارے کی وہ تمام نمایاں کوششیں اور جدوجہد ہیں جس کے سبب 1973 میں EFLU کو DEEMED UNIVERSITY کا درجہ دیا گیا۔ یونیورسٹی نے ایک بڑی آبادی کو اپنی سرگرمیوں میں شامل کرنے کے لیے دو نئے کیمپس 1973 میں شیلانگ میں اور 1979 میں لکھنؤ میں بھی قائم کیے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے استعمال نے اس کی کامیابی وکامرانی کو مزید ترقی عطا کی ہے۔ 1984 میں CIEFL نے ایجوکیشنل میڈیا ریسرچ سینٹر (EMMRC) قائم کیا۔ اس کا مقصد تمام موضوعات پر پروگرام تیار کرنا اور اس کو نشر کرنا ہے۔ موجودہ وقت میں EFLU میں 7 اسکول اور 26 شعبہ ہیں۔ گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ پروگرام کے علاوہ EFLU مختلف پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ، فاصلاتی اور جز وقتی کورس بھی پیش کرتا ہے۔

کیمپس: یونیورسٹی کا مرکزی کیمپس حیدرآباد میں واقع ہے۔ مزید دو علاقائی سینٹر شمال مشرق اور شمالی ہندوستان کے طلبہ کا خیال کرتے ہوئے لکھنؤ اور شیلانگ میں قائم کیے گئے ہیں۔ علاقائی سنٹر خود اپنے درسی پروگرام اور نصاب طے کرتے اور چلاتے ہیں۔ ان دونوں سنٹرس میں طلبہ کی سہولت کے لیے لائبریری اور ہاسٹل کا بھی انتظام ہے۔

مرکزی کیمپس EFLU حیدرآباد: یہ انگلش اینڈ فارن لنگویجیز یونیورسٹی کا مرکزی کیمپس ہے جو کہ تلنگانہ کے مرکز اور اس کے دارالسلطنت حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ یونیورسٹی کے کیمپسز میں سب سے قدیم کیمپس ہے۔ اس کے 7 اسکول اور 26 شعبہ ہیں جو کہ مندرجہ ذیل کورس پیش کرتے ہیں۔

Undergraduate courses

B.A. Hons (English)

B.Ed (English)

B.A. Hons (Arabic/ French/ German/ Russian/ Spanish)

اسی طرز پر بیشمار پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ کے کورسس بھی جاری ہیں۔

شیلانگ کیمپس: یہ کیمپس شمال-مشرق کے ایک بے حد خوبصورت اور خوشنما شہر شیلانگ میں بسایا گیا ہے۔ یہ 1973 میں مرکزی ادارہ برائے انگریزی وغیر ملکی زبان CIEFL شمال مشرق کیمپس کے طور پر قائم کیا گیا۔ اس کیمپس کے قیام کا مقصد علاقائی لوگوں کی زبان کا خیال رکھتے ہوئے اس علاقے کی تحقیقی

ضروریات کی تکمیل کرنا اور طلبہ و اساتذہ کو اعلی تربیت مہیا کرنا ہے۔

یہاں مندرجہ ذیل کورس ہیں:

B.A. English /Mass Communication and Journalism

M.A. in English/ Linguistics Communication/Journalism/ English Literature

M.Phil and PhD courses in English Literature and English Language, Education

Certificate, Diploma and Advanced Diploma courses in French, German, Spanish and Russian languages

لکھنؤ کیمپس: انگلش اینڈ فارن لنگویجیز یونیورسٹی کا یہ کیمپس گومتی ندی کے کنارے موتی محل کیمپس میں رانا پرتاپ مارگ پر لکھنؤ میں موجود ہے۔

یہ کیمپس 1979 میں شمالی ہندوستان میں واقع یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کو انگریزی درس وتدریس کی تربیت مہیا کرنے لیے شروع کیا گیا لیکن اس کو مکمل طور پر ایک کیمپس کی شکل میں ابھر کر سامنے آنے میں کافی وقت لگا۔ یہ

کیمپس ڈگری کورسز، انگریزی زبان کی تدریس میں PG Diploma اور ریسرچ جیسے مختلف کورسز پیش کرتا ہے۔ یہ کیمپس مستعدی سے یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کے لئے تجدیدی کورسز کا اہتمام و انتظام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے لیے اہلیتی کورسز، PG کورس کے طلبہ کے لیے انگریزی زبان میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے بھی کنٹیکٹ پروگرام، ترسیل وابلاغ میں PG Diploma وغیرہ جیسے کورسز کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ تمام پروگرام کیمپس کی جانب سے صرف Regular طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں فاصلاتی کورس کا انتظام نہیں ہے۔ اس کیمپس کی اپنی لائبریری اور ہاسٹل ہیں۔

نئے کیمپسز کا قیام: یونیورسٹی کے 2006 ایکٹ کے مطابق یونیورسٹی مزید دیگر مقامات پر بھی اپنا کیمپس قائم کرسکتی ہے۔ یونیورسٹی کے چار کیمپس حیدرآباد، ملاپورم، لکھنؤ اور شیلانگ میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

چونکہ یونیورسٹی کا اپنا کل ہند سطح کا منشور ہے، اور یونیورسٹی کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ہندوستان میں پہلی متعدد کیمپس کی حامل یونیورسٹی بنا ہے۔ نئے کیمپس کے پس پشت یونیورسٹی کا مقصد ہندوستان کے ان لوگوں تک اعلی تعلیم کی رسائی کرانا ہے جو کہ شہروں کے باہر پچھڑے علاقوں میں آباد ہیں۔ کیونکہ اب تک ہندوستانی عوام کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو کہ انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کی تعلیم سے محروم ہیں اور اسی لیے وہ کانونٹ اور شہر کے اسکولوں سے پڑھے ہوئے طلبہ سے مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کیمپس کے قیام سے یونیورسٹی ان کی اس کمزوری اور محرومی کو دور کرنے میں مدد کرے گی۔

رمیش موہن لائبریری: رمیش موہن لائبریری کا قیام 1958ء میں عمل میں آیا۔ یہ لائبریری یونیورسٹی کے تدریسی اور تحقیقی پروگراموں کے لئے دستاویز کی تدوین اور معلومات کی فراہمی کے لئے قائم کی گئی تھی۔ لائبریری جولائی 1988 میں نئی عمارت میں منتقل کردی گئی۔ اس کا بنیادی مقصد یونیورسٹی کی تعلیمی اور تحقیقاتی ضروریات سے متعلق کتابوں، صحافتی موضوعات اور دیگر متعلقہ دستاویزات کی معلومات فراہم کرنا ہے۔

لائبریری میں تقریبا 9 لاکھ سے زائد کتابیں ہیں، اور دیگر دستاویزی مواد میں تقریبا 202 اکیڈمی اور ریسرچ اسکالرز کے ذریعہ جمع کیے گئے تقریباً چار ہزار سے زائد ایم فل/ پی ایچ ڈی کے تحقیقاتی مقالے موجود ہیں۔ یہاں ایک چھوٹا سا مجموعہ ہندوستانی زبانوں، آڈیو اور بصری مواد میں موجود ہے۔

سرکاری جرنل: یونیورسٹی کی جانب سے ادب وثقافت کا ایک ششماہی جرنل بھی شائع کیا جاتا ہے۔

غرض یہ ادارہ آج پورے شوکت وجلال کے ساتھ ایشیا کے ایک عظیم خطے اور کثیر آبادی کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اپنے منشور اور مقصد کی پاسداری کرتے ہوئے ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ غیر ملکی زبان وادب میں دلچسپی رکھنے والے اور اس میدان میں دسترس حاصل کرنے کے خواہاں طلبہ واساتذہ کے لئے یہ ادارہ مختلف قسم کے کورسز پیش کرتا ہے جن کے ذریعہ وہ بآسانی اپنی صلاحیتوں کو مزید بہتر اور مستقبل کو تابناک بنا سکتے ہیں۔

بے گناہ قیدی

نام کتاب	بے گناہ قیدی
مصنف	عبدالواحد شیخ
ناشر	فاروس میڈیا
زبان	اردو
صفحات	408
مبصر	ندیم علی، مغربی بنگال

بقول فیض احمد فیض۔۔۔۔۔۔۔

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم وزباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

کچھ مہینے قبل شہر کلکتہ کے ایک معروف ادارے میں منعقدہ ایک سماجی پروگرام میں پہلی بار میں نے اس کتاب (جو ہندی زبان میں تھی) کو برادر محترم شاہنواز علی ریحان (ریسرچ اسکالر، آکسفورڈ یونیورسٹی) کے ہاتھوں دیکھا تو اس کتاب کے عنوان نے مجھ میں تجسس پیدا کیا۔ برادر شاہنواز علی ریحان نے اُسی وقت اُس کتاب اور اسکے مصنف کے بارے میں مختصراً متعارف کرایا۔

کتاب کا عنوان ہی کچھ ایسا تھا کہ اُس دن کے بعد سے ہی اس کتاب کو پڑھنے کی ایک بے چینی نے میرے اندر گھر کرلیا۔ اور میں نے اس کتاب کے لیے اپنے کئی جاننے والوں سے رجوع کیا لیکن یہ کوشش کارآمد ثابت نہیں ہوئی۔ بہرحال جب مجھے پتہ چلا کہ یہ کتاب بے گناہ قیدی Amazon پر دستیاب ہے تو میں نے اس کو باآسانی حاصل کیا۔

یہ کتاب ''بے گناہ قیدی'' دہشتگردی کے واقعات کو آشکار کرنے والی ایسی چشم کشا کتاب ہے جو اس بات کا دعوٰی کرتی ہے کہ دہشت گردی جیسے گھناونے الزام میں ملوث نوجوان (بالخصوص گیارہ جولائی ممبئی لوکل ٹرین سیریل بم دھماکوں میں قید سبھی مسلم نوجوان) معصوم ہوتے ہوئے بھی سالہا سال ملک کی مختلف عدالتوں کی نام نہاد کارروائیوں، پولس کی زیادتیوں سے پُر تفتیشی عمل، تفتیشی ایجنسیوں کے کام کرنے کے غیر انسانی طریقے اور قانونی اداروں کے داؤ پیچ کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ ہولناک مناظر آتے ہیں کہ کس طرح سے ان (معصوموں) پر دہشت گردی کے غلط الزام عائد کر، ملزم سے مجرم اور قصوروار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ اور بالفرض عدالت کا فیصلہ ان تفتیشی ایجنسیوں کی کارروائیوں کے برعکس آ بھی گیا (جیسا کہ کئی بم بلاسٹ کے کیسوں میں ہوا) تو تب تک اس میں اتنی دیر ہوچکی ہوتی ہے کہ ان ملزموں کی عمر کا ایک بڑا دور قید و بند کی زندگی میں ختم ہوچکا ہوتا ہے۔

درج بالا کتاب عبدالواحد شیخ کے ذریعہ لکھی گئی ہے جسے فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ یہ صرف ایک کتاب ہی نہیں بلکہ دہشت گردی (مثلاً کے طور پر گیارہ جولائی

لوکل ٹرین سیریل بم دھماکے، جرمن بیکری بم دھماکہ، مالیگاؤں بم دھماکہ وغیرہ) کی زد میں آنے والے ان نوجوانوں (بالخصوص مسلم نوجوان) کی سچّی آپ بیتی ہے جن پر دہشت گرد ہونے کا ٹھپّہ لگا کر اُن کی عمر کے ایک سنہرے دَور کو برباد کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

اس کتاب کے مصنف عبدالواحد شیخ ہیں۔ جو بذات خود عدالتی نظام کے تعصب پرست فیصلوں، پولس، تفتیشی ایجنسیوں اور سسٹم کے دردناک ٹارچرز کا شکار رہ چکے ہیں، بعدازاں ملت اسلامیہ کے کچھ اداروں کی امداد، وکیلوں اور دیگر لوگوں کی انتھک کوششوں کے باعث ان الزامات سے باہر آئے۔ مصنفنے اس کتاب کے مختلف ابواب میں اُن سیریل بم دھماکوں کے بعد تفتیشی ایجنسیوں، آفیسر وغیرہ کی تلخ حقیقت کو، اشیش کھیتان، ساگنیک چودھری جیسے دیگر بے باک صحافیوں کی تفتیشی رپورٹ، اور دیگر ثبوت بھی قابل اعتماد ذرائع سے اکٹھا کرتے ہوئے سامنے لانے کا دعویٰ کیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح اپنی نااہلی کو چُھپانے کے لیے وہ طرح طرح کے ہتھکنڈے اور حربے اپناتے ہیں۔ مصنف نے، اس کتاب کے ذریعہ ان حقائق کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے تفتیش اور انکوائری (نارکوٹیسٹ، برین میپنگ و دیگر سائنسی ٹیسٹ) کے نام پر ملزموں اور ان کے قریبی لوگوں کو طرح طرح (جھوٹے الزامات، قانون و اقتدار کا غلط استعمال کر) سے ہراساں کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کا چوتھا ستون سمجھی جانے والی میڈیا (خبر رساں ادارے، سوائے چند ایک کے) تو ایسے معاملات میں اپنی جانبدارانہ رویہ میں پیش پیش رہتے ہیں۔ جو کورٹ میں مقدمہ چلنے سے قبل ہی میڈیا ٹرائل کر کے ملزموں کو مجرم اور گنہگار ہونے کے اعلانات کے ساتھ مشتہر کر دیتے ہیں۔ یہ کتاب میڈیا کے اُس تعصب پسند کردار اور غیر ذمہ دارانہ رویّوں، جن کی وجہ سے معصوم ملزموں اور ان کے گھر کے لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں بھی اُٹھانی پڑتیں ہیں، کا ذکر کرتی ہے۔ عہدے اور طاقت کا غلط استعمال کر پولس اور جیل کے اہلکاروں کے ذریعہ ملزموں کو قانونی امداد حاصل کرنے سے کافی حد تک ڈرانے دھمکانے کے عمل کی وضاحت بھی مصنف نے کی ہے۔ اور بتایا کہ اگر وہ کسی طرح سے اپنے لیے قانونی امداد کا انتظام کر بھی لیں تو ان ملزموں پر کیے جانے والے ٹارچر کی شدت میں اضافہ کرتے انہیں بالکل بھی دیر نہیں لگتی۔ قانون کا محافظ کہا جانے والا طبقہ، پولس اور انکے حامی ادارے، اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے ملزموں کو فرضی انکاؤنٹرز کا شکار بناتے ہیں، کوڑیوں کے مول بکنے والے جھوٹے گواہوں کو بہ آسانی تیار کر لیتے ہیں اور اگر کوئی راضی نہ بھی ہوا تو ان انصاف پسند لوگوں کو ڈرا دھمکا کے تیار کر لینا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ انسانیت کو شرمسار کرنے والے سرکاری اسپتال کے اُن ڈاکٹروں کا بھی ذکر بھی اس کتاب میں کیا گیا ہے جنہوں نے ڈاکٹری جیسے نیک پیشے کی عظمت کو محض ذاتی مفادات کے لیے بالائے طاق رکھ دیا اور تفتیشی ایجنسیوں کے ہر شاطرانہ اقدامات میں انکا ساتھ دینے میں کوئی کجی نہیں برتی۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف سرکاری اداروں (پولس، اے ٹی ایس وغیرہ) کے کئی ظالم و کرپٹ افسران (اے ٹی ایس چیف رگھونشی، پولس کمیشنر اے این رائے، پولس آفیسر پھڑکے، پولس آفیسر الکنورے اور ان جیسے کئی) کا ذکر کرتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان نیک افسروں، ججوں، وکیلوں (پولس آفیسر ہیمنت کرکرے، اے سی پی ونود بھٹ، شری ابھئے تھیپسے جیسے انصاف پسند جج، مرحوم ایڈووکیٹ شاہد اعظمی) کا بھی تذکرہ اس میں شامل ہے جو کہ آج بھی حق اور سچائی کی بقاء کے لیے اس کرپٹ سسٹم سے لڑتے ہیں۔ لیکن اکثر انہیں مایوسی اور ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ بلکہ ان جیسے کتنوں کو یا تو قتل کروا دیا جاتا ہے یا تو اس قدر ذہنی دباؤ ان پر ڈالے جاتے ہیں کہ ان کے سامنے بس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہو اور وہ بھی خودکشی کا۔

مصنف نے اس کتاب میں وہ مشورے بھی رکھنے کی کوشش کی ہے جن کو اگر وقت رہتے خاطر میں لایا جائے تو کئی بے قصوروں (جن پر دہشتگرد ہونے کا الزام عائد کر انکی زندگی کے ایک اچھے خاصے دور کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے) کو قانونی امداد فراہم کر انہیں ان الزامات سے بری کرایا جاسکتا ہے۔ خود مصنف کی رہائی اس کی بہترین مثال ہے۔ مصنف کا ماننا ہے کہ اس نے ان سارے واقعات کو یکجا کر ایک کتابی شکل اس لیے دی ہے تاکہ خدانخواستہ اگر ایسے دور سے کسی معصوم کو گزرنا پڑا اور ایسے ستم زدہ حالات نے انہیں گھر کر لیا، تو وہ بالکل بھی ہمت نہ کھوئیں اور خدا وحدہٗ لاشریک پر مکمل بھروسہ رکھتے ہوئے صبر کے ساتھ اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کی جدوجہد میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔

یہ کتاب اپنے ساتھ کئی سوالات چھوڑ جاتی ہے کہ۔۔۔

آخر کب تک قانون کا سہارا لے کر پولس اور تفتیشی ادارے اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے بے گناہ نوجوانوں کو ایسے ہی قید کرتے رہیں گے اور اس طرح اس ملک کے بے قصور نوجوانوں کا استحصال کیا جاتا رہے گا؟

ان بے گناہوں کے ساتھ ان کے گھر والوں کو کب تک ذہنی و جسمانی اذیتوں سے دوچار ہوتا رہنا پڑے گا؟

کب تک قانون کے رکشک ہی قانون کے بھکشک بنے رہیں گے؟

کب تک انصاف پسند لوگ جنہوں نے حق و انصاف کی بقاء کے لیے اس کرپٹ سسٹم کا مقابلہ کیا، شکار بنتے رہیں گے؟

کیا ہمارے ملک کے قانون کے تحت اس کرپٹ سسٹم میں ملوث ان آفیسران کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بنتا جن کی وجہ سے کئی معصوم ملزموں نے اپنے عمر کا ایک سنہرا دور کھو دیا؟ اگر واقعی میں ایسا کوئی قانون ہے تو اسکا نفاذ عمل میں کیوں نہیں آتا؟ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب اگر جلد از جلد نہیں ملا تو وہ دن دُور نہیں کہ جب پولس، قانون، عدالت، انصاف، انسانیت وغیرہ سے عام شہریوں کا دل اُچاٹ ہوتا ہوا نظر آئے گا اور یہ ساری باتیں ان کے نزدیک محض کتابی باتوں سے زیادہ کی حیثیت نہ رکھیں گی۔

رونے کا بھی ثبوت عدالت کو چاہیے
آنسو تمہارے گال پہ ٹھہرا ہوا ملے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

جویریہ ارم

وادی کشمیر میں ایک 8 سالہ لڑکی کو 10 جنوری کو اغواء کیا گیا ایک ہفتہ قید میں رکھ کر اس کی عصمت لوٹی گئی پھر اسے قتل کر کے پھینک دیا گیا۔ بتایا جارہا ہے کہ لڑکی کے جسم پر انسانی دانتوں کے نشان پائے گئے اور اس کے پیر توڑے گئے تھے۔ کھٹوا ضلع سے تعلق رکھنے والی آصفہ بانو کے ساتھ ہونے والا یہ حادثہ انتہائی ہولناک ہے، کہا جارہا ہے کہ باوثوق افراد اس معاملے میں ملوث ہیں جنھیں بچایا جارہا ہے۔ دوسری طرف دو الگ الگ واقعات میں اتر پردیش میں عصمت ریزی کے واقعات پیش آئے ایک 16 سالہ لڑکی چھیڑ چھاڑ جنسی ہراسانی کی شکار ہوئی تھی، میڈیکل جانچ کے بعد خودکشی کر اپنی جان گنوادی، ملزمین میں دولڑکے جن کی عمر 22 سال اور 24 سال ہیں ایک لڑکے کا نام ضمیر بتایا جارہا ہے۔ دوسری خاتون اتر پردیش کے ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی 32 سالہ خاتون جو کہ حاملہ بھی تھی عصمت ریزی کی شکار ہوئی۔ پاکستانی پنجاب کے قصور ضلع کی رہنے والی زینب امین انصاری جس کی عمر 7 سال تھی اغوا، عصمت ریزی اور قتل کی شکار ہوئی اور مردہ حالت میں ایک کوڑے کے ڈھیر سے برآمد ہوئی۔ قصور میں 2015 سے اب تک تقریباً ایک درجن ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔ 6 سالہ کائنات اس وقت زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے جسے کچھ عرصہ قبل انتہائی تشویشناک حالت میں اغوا، عصمت ریزی کے بعد برآمد کیا گیا تھا۔ ملزم پکڑا جاچکا ہے جو کہ ایک 23 سالہ نوجواں عمران علی ہے جس نے اب تک 10 لڑکیوں کے ساتھ عصمت ریزی اور قتل کا اقبالِ جرم کیا ہے۔

اس طرح کے دل خراش، دل دہلانے والے واقعات انتہائی افسوس ناک ہیں۔ کیا ہم اس دین کے پیرو نہیں ہیں جو خواتین کے حقوق کا علمبردار ہے؟ یا پھر بیٹی کی پیدائش باعثِ رحمت نہیں؟ رحمِ مادر میں اس کی ہلاکت گناہِ کبیرہ اور قیامت میں سخت پکڑ کا سبب ہے۔ کیا بیٹی کی پرورش جنت میں نبی کریمؐ کے قربت کا موجب نہیں ہے؟ عورت کے ساتھ کی گئی ہر بدسلوکی روزِ محشر اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے بلکہ مرد کے لئے اچھائی کا معیار عورت کے ساتھ نیک سلوک کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر ہمارے معاشروں میں، سماج میں اس طرح کے واقعات ہوں کہ معصوم ننھی بچیاں زیادتی کی شکار ہوجائیں، خواتین جہیز کے لئے ہراساں کی جائیں، خرید و فروخت اور نفس و جنس کی تسکین تک اس کی حیثیت گھٹادی جائے اور مسلمان تماشائی بن جائے یا مذمتی بیانات یالفاظی کرتا رہ جائے تو کیا قیامت کے دن اللہ ان سے سوال نہیں کرے گا؟ کیا اللہ ہم سب مرد و خواتین کو مذمتی بیانات، افسوس کے اظہار، زبانی جمع خرچ کرنے پر بری الذمہ قرار دے کر روزِ محشر اپنی عالی شان جنتوں میں داخل کردے گا؟

روزِ محشر رب العالمین جب زندہ درگور کی گئی لڑکی کو پوچھے گا کہ کس قصور میں ماری گئی تھی تب کیا صرف اپنے قاتل کی نشاندہی کرے گی یا پھر دنیا میں اپنے آس پاس پائے جانے والی انسانی بھیڑ کو اللہ کی عدالت میں گھسیٹے گی؟

نبی کریمؐ بھی ایک ایسے سماج میں تنہا کھڑے ہوئے تھے جو لڑکیوں اور خواتین کے لئے بالکل سازگار نہیں تھا، نبی کریمؐ کے پاس نورِ ہدایت، حکمت اور ایمانی حرارت ہی تھی کہ آپ نے سماج میں ہوتے ہوئے ظلم کو اس طرح جڑ سے اکھاڑ دیا کہ ایک عورت گھر کی ملکہ سے لے کر ایک معلم، سیاسی، سماجی، معاشی معاملات کی ماہر تک کہلائی جہاں اس کی حیثیت مردوں سے کسی بھی طرح کم تر یا بالاتر ہونے کے بجائے یکساں تسلیم کی گئی۔ اللہ کے بندوں کی حیثیت تقویٰ و پرہیزگاری کے معیار پر لیاقت، شجاعت، صداقت، قابلیت کے اوصاف پر تسلیم کی گئی ہے۔ نبی کریمؐ کے جانثار امتیوں کا کیسا معاشرہ ہم آج دیکھ رہے ہیں؟ ہماری غیرت اور حمیت ہمیں کچھ کرنے پر آمادہ ہی نہیں کر رہی ہے کہ اس مسئلہ کا سدباب کیا جائے۔ جیسے نبیؐ اور صحابہ رضوان اللہ نے حکمت اور بصیرت سے نورِ ہدایت کی روشنی میں کیا تھا۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم نبی آخر الزماںؐ اور صحابہ کرام رضوان اللہ جیسے Solution Oriented لوگ نہیں ہیں، ہمارے ہاں فقہا، صلحاء بنانے کا رواج عام ہے لیکن حکمت سکھانے کا عمل رائج ہی نہیں ہے۔ بہت سے ایسے سوال ہیں جن کے جواب اب ہمیں ڈھونڈنے پڑیں گے، ہمیں اپنے اسلاف کی طرح اپنے مسائل کے حل کے لئے خود جدوجہد اور سخت کوشش کرنا ہوگی نا کہ ابابیلوں کا انتظار۔۔۔۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ مجموعی طور پر ہمارے سماج پر، اس کے افراد پر، ماحول پر اور نفسیات پر اس طرح کے واقعات کے کیا اثرات قائم ہوں گے؟ ان گھناؤنے واقعات کے متاثرین پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس کا حل کیسے نکالا جائے؟ اور اہم سوال کہ مرد و عورت ایک دوسرے کو اور خود اپنے آپ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ ان میں سے تمام ہی سوالات اور ذیلی سوالات و پہلوؤں پر باری باری غور کرتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ جنسی ہراسانی، عصمت ریزی کے بڑھتے ہوئے واقعات خواتین اور خصوصاً معصوم ننھی بچیوں کے اندر خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ مردوں پر بے اعتباری پیدا کردیں اور عمومی طور پر مردوں کو ہوس کے غلام سمجھا جانے لگے۔ ہر طرف سے ہم دیکھ رہے ہیں کہا جارہا ہے کہ بچیوں کو یہ سکھایا جائے کہ اچھا لمس اور برا لمس کیا ہے، خطرہ کو بروقت وہ بھانپ لیں وغیرہ وغیرہ۔ ہوسکتا ہے کہ بچیاں خطرہ کو بھانپ لیں اور کئی جگہوں پر وہ محفوظ ہوجائیں یہ بھی ممکن ہے کہ اوباش اور چھچھورے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ شریف النفس لڑکے اور نوجوان بھی شک کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ گلی، محلوں، بازاروں میں کوئی شریف آدمی خواتین کی امداد یا ہمدردی کی کوشش کریں اور بچیوں کی خوف زدہ نگاہیں انھیں سخت الجھن میں ڈال دے۔ جب خواتین اپنے آس پاس پائے جانے والے مردوں پر اعتبار نہ کرپائیں تو یہ صرف ان کی نہیں بلکہ مردوں کے لئے بھی سخت الجھن و پریشانی کا

باعث ہوگا۔ ایسا ہر گز نہیں ہے کہ صرف متاثرہ پر ہی قیامت ٹوٹتی ہے صرف وہی معصوم تباہ نہیں ہوتی بلکہ پورا سماج کسی نہ کسی حد تک اس کی زد میں آتا ہے۔ اگر متاثرین کے کرب کی بات کریں کہ ان ننھی پریوں پر کیا گزری ہوگی تو روح کانپ جاتی ہے، معصوم لڑکیاں کتنا روئی ہوں گی، کتنا گڑگڑائی ہوں گی، کس ذہنی اور جسمانی تکلیف سے گذری ہوں گی؟ مگر ظالم کو رحم نہ آیا معصوم کے آنسو دیکھ کر بھی باز نہ آیا ہوگا، کسی معصوم کی آنکھوں کے آنسو اور تکلیف کیسے کسی کو نیند آنے دے سکتے ہیں۔ بے قصور اس طرح کے حادثات اور زیادتی کے بعد جب بچ جاتی ہیں تو معاشرے کے پاس ان کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا، انھیں پاکیزہ تصور نہیں کیا جاتا، ہے کوئی غیرت مند جو آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لے گا؟ مر جائے تو لوگ موم بتیاں جلانے اکٹھا ہو جاتے ہیں زندہ بچ جانے پر ساتھ چلنے کے لئے بھی آجائیں گے؟ جب کہ ہماری سوسائٹی میں بچوں والے باپ کو دوسری شادی کے لئے بھی کنواری لڑکی کی تلاش ہوتی ہے، کیا مجرمین سے اپیل کی جائے کہ اپنی زیادتی کی شکار بنائی جانے والی لڑکی کو زندہ نہ چھوڑیں بلکہ قتل کر کے اس پر رحم کر دیں؟ اصل بات تو یہ ہے کہ عورت اور مرد کو ہماری سوسائٹی اخلاق، کردار قابلیت تقویٰ کے معیار پر دیکھتی ہی نہیں۔ شریف اور دین دار لڑکی کو مرد اپنے لیے معیار بناتے بھی ہیں تو اس کے پیچھے بھی ان کا منشاء کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

آخر ہماری سوسائٹی میں عورت کی حیثیت و مقام کیا ہے؟ ایک اعلیٰ مخلوق اور ایک ادنیٰ مخلوق پر مبنی معاشرہ انسانی سماج کہلاتا ہے؟ جہاں مرد بالادست اور اعلیٰ اور عورت ثانوی حیثیت میں ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر اللہ کے ساتھ تعلق، اس کی بندگی، انسانیت، اخلاقیات، نیکی اور بدی، جرم و سزا، انعام و اکرام کے پہلو سے مرد و عورت برابر کیوں ہیں؟ دونوں خدا کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے، دونوں سے یکساں تقاضا ہے کہ وہ انسانیت کے معیار پر پورے اتریں دونوں پر برابر کی اخلاقی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، دونوں نیکی اور بدی کی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں دونوں کا اعمال نامہ مرتب ہو رہا ہے دونوں سے برابر کی سطح پر ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ دونوں کے لئے دنیا اور آخرت میں برابر کی سزائیں اور انعامات ہیں۔ مرد ہو یا عورت جو بھی نیکی کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگ ہیں جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔ (سورۃ النساء)۔

ازدواجی تعلق کی بات کی جائے تب بھی سورۃ بقرۃ آیت 187 میں عورت کو مرد کا لباس اور مرد کو عورت کا لباس قرار دیا دونوں کو ایک لفظ سے تشبیہ دینے سے دونوں کی برابری ظاہر ہوتی ہے۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لئے باعثِ زینت اور آرام کا موجب ہوں نا کہ شادی بوجھ اور عذاب بن جائیں۔ دونوں کو یکساں ایک دوسرے کے لئے راحت، اور آلودگی اور گندگی سے بچانے والا لباس ہونا چاہیے اور نیکی کے کاموں کا ساتھی بھلائی پھیلانے اور برائی مٹانے میں معاون و مددگار ہونا چاہیے۔ برصغیر کے سماجی نابرابری کے کلچر کو ہم نے ایسا گھول کر پی لیا ہے کہ مرد نہ اپنی بالادستی سے نکل پاتا ہے اور نہ عورت اپنے احساسِ کم تری اور عدم تحفظ سے نکل پاتی ہے۔ اگر ہم اپنے عائلی ماحول پر نظر دوڑائیں تو دیکھتے ہیں کہ یہاں Survival of fittest کا کھیل چل رہا ہے اجنبی ماحول میں اپنے گھر کو چھوڑ کر آنے والی ایک لڑکی کو بے شمار آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے اس کے نئے گھر میں قدم جمانے کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ گھر کے تمام افراد کی کمزوریوں سے واقف ہو جاتی ہے تو خاتون خانہ وہ سب سود کے ساتھ شوہر نامدار کو زبانِ فخر سے واپس کر دیتی ہے جو انھوں نے نئے گھر میں شروعات کے دنوں اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ عدم تحفظ کا شکار خواتین جب اللہ کے بجائے گھر کے مردوں میں اپنا سہارا ڈھونڈے انہیں اپنا محافظ، رازق سمجھنے لگے تو یہ insecuruties اور مرد کی احساس برتری ستم بالائے ستم بن کر اکثر گھروں کے ماحول کو خراب کر دیتی ہے یا کم از کم عرصے دراز تک رسہ کشی کا سلسلہ چلنے کے بعد زندگی نارمل موڈ پر آتی ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی چیزوں میں الجھنے مسلمانوں سے دنیا کو بدل دینے، انقلاب کے نقیب بننے، انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے، اسلام کے نظامِ حیات کو گلی کوچوں، قریہ قریہ پہنچانے اور نافذ کرنے کا کام کیسے ہو پائے گا؟ اخروی نجات کیسے مل پائے گی؟

جہاں عورتوں اور چھوٹے بچوں میں شعور بیداری کی مہم چلانے کی بات ہوتی ہے مردوں میں مہمات کی بات کیوں نہیں ہوتی۔ ہمیں چاہئے کہ بچپن سے بچوں کو دین کی سمجھ حکمت سکھائیں۔ گھریلو ماحول کو سدھاریں، گھر کے لڑکوں کو عورتوں کی عزت کرنے والے اور اپنی طرح کا انسان سمجھنے والے بنائیں، انھیں یہ بتانا پڑے گا کہ اپنے جذبات کی تسکین کے لئے اس کا کسی عورت کو بے وقوف بنانا، گمراہ کرنا یا زبردستی کرنا، اسے عورت سے کم تر اور بے حیثیت کر دے گا۔ یہ اس کی بہادری نہیں بلکہ کمزوری کی علامت ہوگا۔ خواتین کو ہم خود کفیل بنانے پر زیادہ زور دیتے ہیں جب کہ ان کو یہ سکھانا چاہئے کہ مرد بھی اپنی ہی طرح کے انسان ہیں۔ انہیں زندگی اللہ کے سہارے، اس پر توکل اور بھروسے پر گزارنی چاہئے ان کی زندگی کا مقصد اپنے گھر کے مردوں کی خوشنودی کے اردگرد نہیں بلکہ اللہ کے راضی ہو جانے کے گرد گھومنی چاہئے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے جو تگ و دو ہونی چاہئے وہ کرے، اللہ رب العالمین کو ناراض کر کے مرد و خواتین اپنی چالاکیوں سے ایک دوسرے پر فتح حاصل کرنے کی دوڑ میں نہ لگ جائے۔ انسانوں سے محبت کریں وہ بھی اللہ کی خاطر۔ تب ہی ہم دیکھیں گے کہ ایک مثالی معاشرہ بنے گا جو ہمارے مقصد حیات، بندگی کے تقاضوں کو پورا کر پائے گا۔ کیوں کہ صرف سخت قوانین ہی جرائم کا سدباب کرنے کے لئے تنہا کافی نہیں ہوتے بلکہ معاشرہ کی اخلاقی حیثیت بھی بہت ہی اہم رول ادا کرتی ہے، ہاں اس بات سے انکار نہیں کہ قوانین اور جرائم پر سخت سزائیں ہوں تو عوام میں جرائم سے بچنے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے لیکن Law and order کی صورتحال، پولیس اور انتظامیہ کی چوکسی، انصاف کے حصول کا آسان عمل ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ عدالتوں میں کیس کا نمبر آتے آتے متاثرین اور ان کے ورثاء کے حوصلہ جواب دے چکے ہوتے ہیں اگر انصاف کے حصول کے لئے عوام قانون اپنے ہاتھ میں لے لے تو امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا اس لئے عدلیہ کو بھی اور پولیس محکمہ کو بھی اصلاحات کے عمل سے نوازنا چاہئے۔

حیا ہی زندگی ہے

رافع اطہر

(ان نوجوانوں کے نام جو فحاشی اور عریانیت کے دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں)

وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ گھڑی دیکھی تو فجر کا بالکل آخری وقت تھا۔ وضو کرنے کے لئے دوڑ لگائی لیکن پھر کچھ محسوس ہوا۔ پھر یہ سمجھنے میں بھی دیر نہ لگی کہ اسے غسل کی حاجت تھی۔ اب نماز پڑھنا ممکن نہ تھا۔ اسے قلق ہوا، لیکن اچانک ایک خیال نے جیسے اس کے اندر خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ایسی خوشی پوری زندگی میں شاید ہی محسوس ہوئی تھی۔ آخر اس کی جدوجہد کا نتیجہ جو ظاہر ہونے لگا تھا! وہ کامیاب ہو رہا تھا۔

پہلے وہ ایک پراعتماد، تیز وطرار، ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ اسی طرح اس کے لئے نمازوں میں رونا اور بے اختیار مسکرا دینا کوئی انہونی بات نہ تھی جیسے کہ دوسروں کے لئے ہوتی تھی۔ قرآن سے اس کا شغف کسی سے چھپا نہ تھا۔ ہر دم قرآن اور کتابوں کی باتیں کرنا گویا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ لیکن یہ تمام چیزیں آہستہ آہستہ کم ہوتی گئیں۔ اسکی پڑھائی متاثر ہونے لگی، نمازوں میں اسکا خشوع اس سے چھنتا گیا اور قرآن و دیگر کتابوں سے دوری روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ جس کی خوداعتمادی اور کنٹرول سے لوگ متاثر ہوتے اور جذبہ حاصل کرتے تھے اب اپنے آپ پر سے قابو کھوتا جا رہا تھا اور خود کو تنہا اور بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے سامنے کوئی مقصد، ہدف اور محرک باقی نہیں رہ گیا تھا اور زندگی بالکل بیکار لگنے لگی تھی۔

ابتداء میں تو اسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ پھر جیسے جیسے غور کرتا گیا، وجہ سمجھ آتی گئی لیکن وہ اس پر بندھ باندھنے میں ناکام رہا۔ بات پہلے پہل صنف نازک کو دیکھنے اور غیر ضروری کاموں اور باتوں میں وقت صرف کرنے سے شروع ہوئی۔ پھر شہوانی کتابیں پڑھنے اور فلمیں دیکھنے کا مرحلہ آیا۔ پھر بات محض فلموں سے گزر کر آہستہ آہستہ فحش فلموں اور ویب سائٹس تک جا پہنچی، اور آخر میں وہ گھناؤنا کام بھی کر گزرا جس کا وہ پہلے تصور تک نہ کر سکتا تھا، اور پھر خود لذتی کے دلدل میں دھنستا گیا۔ نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ ہر بار خدا سے معافی مانگتا، اگلی بار نہ کرنے کا عزم کرتا لیکن پھر کچھ دنوں بعد عزم کا گھڑا دھڑام سے آ گرتا۔ مختلف ترکیبیں آزمالیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اسے لگنے لگا کہ وہ اب شاید کبھی اس دلدل سے نہ نکل پائے گا۔ مایوسی کا دائرہ لگاتار بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنا آپ کبھی اتنا کمزور نہ لگا تھا۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک دن ذہن میں آیا کہ کیوں نہ خدا سے وعدہ کر کے دیکھے؟ آخر کار اللہ کی ہستی کی عظمت اور وعدہ وفا نہ کرنے کے انجام کو ذہن میں رکھ کر پورے شعور کے ساتھ اس گناہ سے بچنے کا عہد کیا اور آج وہ عہد اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ کئی مہینوں بعد وہ فطری طور پر جنابت کی حالت میں نیند سے جاگا تھا اور بجائے اجنبیت کے ایک احساس آشنائی سے سرشار تھا۔ اور ہو بھی کیوں نہ؟ آخر اسکی حیا اسے دوبارہ مل گئی تھی، وہ اپنے آپ کو دوبارہ سے زندہ محسوس کر رہا تھا۔ اور کیوں نہ کرے؟ آخر حیا کے معنی ہی زندگی کے تھے۔

قلم اٹھاؤ

قلم اٹھاؤ
اداس لوگو!
اداسیوں کا لباس تن سے اتار پھینکو
اے خواہشوں کے
اسیر لوگو!
حقیقتوں سے نظر نہ پھیرو
کئی سسکتی ہوئی سی بے سود خواہشوں کا
جو آج نوحہ سنا رہے ہو
اسی پہ رونا شعار تم نے بنا لیا ہے
ذرا بتاؤ!
کہ دیکھنا خواب،
انہی میں جینا،
انہی میں شام و سحر بتانا
عجب نہیں ہے؟
قلم اٹھاؤ!

حقیقتوں کا نکالو صفحہ
اور اس پہ لکھو کہ بھوک کیا ہے؟
یہ ننگ کیا ہے؟
اگر تمہیں اس جہانِ فانی
کی چاہتوں سے ملے جو فرصت
تو آنکھ کھولو!
ضرور لکھو فضاؤں کے دکھ
ہواؤں کے دکھ
وہ بیٹیوں کی رداؤں کے دکھ
غریب لوگوں کے خواب لکھو
تم ان کے عذاب لکھو
خیال کی اس عجیب و کمزور
ایک دنیا میں جینے والو!
تمہیں تو ہجر و وصال لکھنا ہے
اور پھولوں کو گال لکھنا ہے

حسن کو لازوال لکھنا ہے
زلف، عارض یہ نین، کنگن
انہی کو تم نے کمال لکھنا ہے
تم کو کیا غم؟
محبتوں کے غموں کو تم نے
عظیم غم جو بنا لیا ہے
جو مفلسی کی اذیتوں کے
عذاب ٹوٹے تو کیا کرو گے؟
سو اس سے پہلے ہی آنکھ کھولو
نہ خواب لکھو؟
جو زندگی کو ترس رہے ہیں
کبھی تو ان کے عذاب لکھو
قلم اٹھاؤ
اداس لوگو!!

فوزیہ رباب، مپوسا، گوا

اپنے دل سے کہیں، محبت کرے

محی الدین غازی

چمن کے حسن اور رنگینی کو بڑھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خوب صورت اور خوشبودار پھولوں کے پودے لگائے جائیں اور پھران کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے۔ انسانوں کی اس دنیا کو حسین اور دل کش بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے انسانوں کے لئے کوئی خوب صورت سی مثال قائم کردی جائے کہ انسانوں کو انسانوں سے آباد یہ دنیا بہت اچھی نظر آنے لگے، یہ طریقہ حسین بھی ہے اور آسان بھی ہے، اسے ہر کوئی اختیار کرسکتا ہے، نہ اس کے لئے طاقت اور اقتدار درکار ہے اور نہ ہی دولت اور وسائل کی ضرورت ہے، بس سینے میں ایک زندہ، جیتا جاگتا اور حسن وجمال کو چاہنے والا دل ہونا چاہئے۔ میں نے بہت قریب سے کچھ لوگوں کو محبت کے پودے لگاتے ہوئے اور بڑے چاؤ اور لگن سے انہیں سیراب کرتے ہوئے پایا، اس وقت ان کا تذکرہ کرنے کے لئے طبیعت بے تاب ہے، کہ پھر موقعہ ملے، ملے نہ ملے۔

میرے نانا ابا اور نانی امی: امی کا انتقال ہوا تو ہم گیارہ بھائی بہن تھے، میں سب سے بڑا تھا، مگر کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا، اور میرے چھوٹے بھائی بہن چھوٹے اور کچھ تو بہت چھوٹے تھے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کی مناسب پرورش اور صحیح دیکھ بھال کے لئے مجھے شادی کرلینی چاہئے، اور گھر میں کسی صورت سوتیلی ماں کو نہیں آنا چاہئے۔ لیکن میرے نانا ابا اس رائے کے حق میں نہیں تھے، انہوں نے امی کے انتقال کے بعد ہی سے ابا جان کے لئے مناسب رشتہ تلاش کرنا شروع کردیا، اور پھر چند ماہ کے اندر ابا جان کا نکاح اپنے ایک دوست کی بیٹی سے کرادیا، نانا ابا اور نانی امی زندگی بھر ہماری دوسری امی کو اپنی بیٹی کی طرح مانتے رہے، وہ اکثر ہم بھائی بہنوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ اپنی دوسری امی کے ساتھ بہت اچھی طرح رہا کرو جس طرح تم سب اپنی پہلی امی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ نانا ابا اور نانی امی کے اس نیک جذبے اور اس حسین رویے کی برکتیں ہم سب اپنے گھر میں برسہا برس سے محسوس کررہے ہیں۔

میری خالہ اپیا: خالہ اپیا کے حصے میں تین طرح کے بچے آئے، کچھ وہ جو ان کے پہلے شوہر سے تھے، کچھ وہ جو پہلے شوہر سے جدا ہونے کے بعد ان کے دوسرے شوہر سے ہوئے، اور کچھ وہ جو ان کے دوسرے شوہر کی پہلی بیوی سے تھے، خالہ اپیا نے اپنے بہت کشادہ اور آرام دہ دل میں ان سب کو بسالیا۔ تین طرح کے بچوں کی وہ حقیقی ماں بن گئیں۔ جن بچوں کی وہ حقیقی ماں نہیں ہیں، اگر ان سے ساری دنیا مل کر کہے کہ یہ تمہاری حقیقی ماں نہیں ہیں تو شاید وہ ماننے سے انکار کردیں۔

میرے بچوں کے نانا اور نانی: جب میں نے اپنی پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی، تو بہت سے لوگوں نے ناراضگی کا اظہار کیا، لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر بچوں کے نانا اور نانی کی تھی مبادا میں ان کی محبتوں سے محروم نہ ہوجاؤں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے دوسرا نکاح کرلیا ہے، تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ ان کا ردعمل کس طرح کا ہوگا، لیکن جو ردعمل سامنے آیا اس نے مجھے حیران کردیا، میں دنیا کی سب سے اونچی عمارت کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوا تھا لیکن اس دن ان دونوں کے قد کی بلندی کو دیکھ کر حیرت واستعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا، انہوں نے پوری بات سن لینے کے بعد تسلی بخش لہجے میں کہا کہ اب تک ہماری دو بیٹیاں تھیں مگر آج سے ہم سمجھیں گے کہ ہماری تین بیٹیاں ہوگئی ہیں۔ میرے دل کو سکون ملا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس کے بعد انہوں نے اس نئے رشتے کو بڑی ہی خوب صورتی سے نبایا، انہوں نے اپنی بیٹی کی سوکن کو اپنی بیٹی بنایا اور اس طرح بنایا کہ وہ سگی بیٹی کی طرح عزیز لگنے لگی۔ میری پہلی بیوی کے بچوں کے لئے وہ مشفق نانا اور نانی تھے ہی میری دوسری بیوی کا بچہ بھی ان کا نواسا بلکہ چہیتا نواسا بن گیا، ان کا گھر میری پہلی بیوی کا میکہ تو تھا ہی دوسری بیوی کے لئے بھی وہ دوسرا میکہ اور ماں کے گھر کی طرح محبت کا گہوارہ بن گیا۔ میں جب بھی اپنی دوسری بیگم کے ساتھ اپنی پہلی سسرال جاتا ہوں بچوں کی نانی بڑے شوق اور چاؤ سے ہمارے لئے لذیذ کھانوں کا پرتکلف دسترخوان چن دیتی ہیں۔

ایک دن بہت جذباتی ہوکر دوسری بیگم نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بچوں کی نانی سے کہا، امی آپ کھانا کچن میں نہیں بناتی ہیں، وہ حیرت سے دیکھنے لگیں کہ اس جملے کا کیا مطلب ہے، اس نے اگلا جملہ کہا امی آپ کھانا دل میں بناتی ہیں، آپ جو بھی بناتی ہیں سب بہت مزے دار اور لذیذ ہوتا ہے۔ اتنا مزے دار اور لذیذ کھانا دل کے اندر ہی بن سکتا ہے۔

اپنی بیٹی کی سوکن کو بھی اپنی بیٹی بنالینا، اور اس پر اور اس کے بچے پر بے پناہ شفقت اور پیار لٹاتے رہنا بہت سوں کی نظر میں مشکل اور تعجب خیز ہوگا، لیکن میرے بچوں کے نانا اور نانی کے لئے یہ کبھی مشکل نہیں رہا، بنا کسی مشقت اور بنا کسی بناوٹ کے بالکل سادہ اور فطری انداز میں وہ ہم سب پر بے حساب محبت لٹاتے ہیں۔ انہوں نے میرے فیصلے کو محض برداشت اور گوارا نہیں کیا بلکہ اسے بھرپور عزت وتکریم سے نوازا۔

ایک مجلس میں جب میں نے اپنے مشاہدات کی بنیاد پر کہا کہ جن رشتوں کو دنیا سوتیلے رشتے کہتی ہے، انہیں بھی محبت والفت کا خوب صورت رشتہ بنایا جاسکتا ہے تو کئی لوگوں نے مجھ سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ خیالی بات ہے، حقیقت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن میں نے اپنے قریبی ماحول میں جتنا دیکھا ہے اور جس قدر سوچا ہے، کسی بھی رشتے کو محبت کا رشتہ بنالینا بہت آسان ہے، صرف دل کے اندر ایک ہلکی سی تبدیلی کرنی ہوتی ہے، اپنی نگاہ اور اپنے رویے کے تاروں کو نفرت ترسیل کرنے والی لائن سے الگ کرکے محبت ترسیل کرنے والی لائن سے جوڑنا ہوتا ہے، اس کے بعد بڑی آسانی کے ساتھ آپ جس سے چاہیں اور جتنی چاہیں محبت کرسکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان کا نفس بہت سے آسان کاموں کو بہت مشکل بلکہ ناممکن بنا کر پیش کرتا ہے۔

دل سے محبت کے چشمے جاری ہوتے ہیں تو نیکی اور بھلائی کے بہت سے پودے سیراب ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں، ایسے ہی پودوں سے زمین کا بناؤ سنگھار ہوتا ہے۔

تحریر بضمن ادبی اشاعت

اسلامی ادب

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ادب کا اسلام سے گہرا رشتہ ہے بلکہ صحیح معنوں میں وہی ادب عظیم ادب کہلانے کا مستحق ہے جس کی روح اسلام کی تعلیمات کے مغایر نہ ہو، عظیم ادب وہی ادب ہے جس کا مضمون مؤدب ہو اور پیرایہء اظہار بھی مؤدب ہو، یعنی ہر اعتبار سے اس میں ادب وشرافت کی رعایت ہو، اس کے خلاف جو بھی ہوگا وہ کم تر ادب کہلائے گا۔ اسلام صرف عقائد کا مجموعہ نہیں، یہ مکمل تہذیب ہے اور ادب وشاعری پر محیط ہے۔ اسلام نے ادب وشاعری کو جلا بخشی اور اس سے اصلاح وتعمیر کا کام لیا، بقول حالی:

ادب میں پڑی جان ان کی زباں سے
جلا دیں نے پائی تھی ان کے بیاں سے
سناں کے لئے کام انھوں نے لساں سے
زبانوں کے کوچے تھے بڑھ کر سناں سے
ہوئے ان کے شعروں سے اخلاق صیقل
پڑی ان کے خطبوں سے عالم میں ہل چل

اسلام کا نظام حیات دراصل عقیدہ وعمل کی جمالیات کا نام ہے۔ اس نے حسن وجمال پر زور دیا ہے، جس سے ذوق کی پاکیزگی اور نفاست پیدا ہوتی ہے، یہاں تک کہ کہا گیا ہے: ''ان اللہ جمیل ویحب الجمال''، یعنی اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، ستاروں کو تابندگی اور چاند اور سورج کو رخشندگی اور پھولوں کو شگفتگی دینے والی ہستی کا انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ ان کے کردار اور گفتار دونوں میں حسن اور سلیقہ پایا جائے۔ ادب گفتار کے اسی سلیقہ کا نام ہے، اس لئے اسلامی ادب میں صرف مضمون میں نہیں بلکہ ہیئت اور شکل میں بھی مناسب طریقہ سے آرائش اور زیبائش اختیار کی جاتی ہے، ہیئت اور اسلوب کو نظر انداز کردینا ذوق ادب کی خلاف ورزی ہے۔ وعظ وتذکیر کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن جب تک وہ فن کی شرطیں نہ پوری کرتا ہو وہ ادب نہیں ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید خود فصاحت وبلاغت کے اعجاز کا نمونہ ہے، وہ فن اور ادب کا سب سے اونچا معیار ہے، اس لئے اسلامی ادیب کی ذمہ داری بھی زبان وبیان کی درستی اور فن کی چابک دستی کے اعتبار سے دوسروں سے کہیں زیادہ ہے، جہاں تک موضوع اور مضمون کا تعلق ہے وہ کچھ بھی ہوسکتا ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو وہ لکھے وہ حیات آمیز، حیات آموز اور حیات افروز ہو، اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا تذکرہ ہوسکتا ہے اس میں ذکر چاند کا بھی ہوگا ستاروں کا بھی، پھولوں کا بھی چشم غزال کا بھی، حور کا بھی اور شراب طہور کا بھی اور آب انگور کا بھی، حضرت یوسف کا بھی اور زلیخا کا بھی، خودی کا بھی اور خدا کا بھی، علمی، تحقیقی، تنقیدی، دینی، اصلاحی، شعری، ادبی، تفریحی، طنزیہ مزاحیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ تمام اصناف سخن اس کے دائرہ میں آتے ہیں بس یہ ضروری ہے کہ ان سے معاشرہ میں خیر کے اقدار کا فروغ ہو۔ اسلامی ادب میں موضوع کی کوئی شرط نہیں ہے، ہر تحریر اسلامی ادب کے دائرہ میں داخل ہوسکتی ہے خواہ اس کا کوئی موضوع ہو بشرطیکہ وہ تحریر ادب کی شرطیں پورا کرتی ہو اور یہ کہ اس میں خدا اور مذہب کے ساتھ شوخیاں نہ ہوں اور اس کے ذریعہ بے حیائی نہ پھیلائی جائے۔ اسلامی ادب دراصل اسلامی شعور کے تحت وجود میں آنے والا فن ہے۔ یہ جب شعر کا جامہ اختیار کرتا ہے تو اقبال کا کلام وجود میں آتا ہے، یہ جب نثر کا جامہ اختیار کرتا ہے تو شبلی اور ابوالکلام کی نثر وجود میں آتی ہے، یہ جب فکشن پیرایہ اظہار اختیار کرتا ہے تو عبدالحلیم شرر

اورنسیم حجازی کے ناول کی شکل میں سامنے آتا ہے، ایک اسلامی ادیب کا کام فن کی شرطیں پوری کرنا ہوتا ہے خواہ موضوع کچھ بھی ہو، وہ ناول اور افسانہ بھی لکھے گا تو اس کا کام نظریاتی قبلہ کو درست کرنا ہوگا لیکن زاہد خشک اور محتسب بن کر نہیں۔ وہ اپنی بات کو فن کے لباس حریر میں پیش کرے گا۔ اس میں اسے استاد کا کم اور خیر خواہ دوست کا رول زیادہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کے لئے اسے حکیمانہ اور متصوفانہ وسیع النظری بھی درکار ہوگی، اس کی تخلیقات میں قاضی کے فیصلہ کی قطعیت یا مفتی کے فتوی کی یبوست نہ ہوگی۔ تخلیقی ادب میں مثال کے طور پر شعر و افسانہ میں اسلامی ادیب کے کہنے کا انداز اور اثر انداز ہونے کا طریقہ زاہد خشک اور شیخ دونوں سے الگ ہوتا ہے۔ وہ خاموشی سے دل کو جیتنے کی کوشش کرتا ہے وہ گیسوے جاناں بن کر شوق کی الجھن کو بڑھاتا اور شمیم گل بن کر مشاں جاں کو معطر کرتا ہے، وہ تیز روی سے کام نہیں لیتا ہے، وہ تلوار نہیں اٹھاتا ہے، وہ سوشل ورکر اور رفارمر کا رول بھی ادا نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ فن کے ذریعہ تعمیری رجحان کی داغ بیل ڈالتا ہے، وہ احساس کی تربیت کرتا ہے، وہ باطن کو بڑی حکمت کے ساتھ ایمان کے نور سے جگمگاتا ہے۔ وہ فکر انسانی کی مشاطگی میں نرمی اور محبت سے کام لیتا ہے وہ دلیل سے زیادہ دل کے دروازوں کو دستک دینے کا قائل ہے۔ لیکن یہ باتیں تخییلی اور تخلیقی ادب کے تناظر میں ہیں، جو خطابت اور مقالہ نگاری سے بالکل الگ صنف سخن ہے۔ یہ قصہ نگاری اور ناول کا میدان ہے۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ قصہ نگاری اور ناول کے میدان میں اسلامی ادب نے اب تک وہ کامیابی حاصل نہیں کی ہے جو اس نے مقالہ نگاری، صحافت، تاریخ نویسی و سوانح اور شاعری اور ایک حد تک تنقید کے میدان میں حاصل کی ہے۔ ادب اسلامی کا یہ میمنہ اور میسرہ کمزور ہے۔ اس میدان میں ان لوگوں کے نام زیادہ ہیں جن کے ذہن اسلامی عقیدہ اور اسلامی اقدار سے ہم آہنگ نہیں چنانچہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ معاشرہ میں مسلسل زہر افشانی کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر قرۃ العین حیدر اردو کی بہت بڑی ناول نگار ہیں، خاص بات یہ کہ ان کے ناولوں میں عصمت چغتائی کے برخلاف کہیں فحاشی نہیں پائی جاتی ہے لیکن ان کے فن میں اسلامی فکر سے ہم آہنگی کا عنصر کم پایا جاتا ہے۔ عبد الحلیم شرر اسلامی ناول نگار ہیں لیکن انہوں نے صرف تاریخی ناول لکھے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد قرآن کے مترجم بھی ہیں اور ناول نگار بھی ہیں، لیکن ناول کا فن ان کے عہد کے بعد بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ عربی میں نجیب محفوظ ناول نگار ہیں جن کو ادب کا نوبل پرائز بھی ملا ہے۔ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی تہذیب اور الحاد کے طرف دار نظر آتے ہیں، عربی میں نجیب کیلانی اچھے ناول نگار اور ڈرامہ نگار ہیں اور اسلامی ادیب ہیں لیکن اس طرح کے نام بہت کم ہیں۔ اسلامی ادب کے ہم نواوں کو فکشن کے میدان کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ادب کے پردہ میں مسموم افکار پیش کرنے والے طاقتور نہ ہوسکیں، ادب کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی جانی چاہئے، ادب میں تاثیر بھی ہے قوت تسخیر بھی ہے، وہی وسیلہ تخریب بھی ہے اور وہی وسیلہ تعمیر بھی ہے، لفظوں میں جادو کا اثر اور جملوں میں دارو کا زہر ہوتا ہے، ادب سے روح بالیدہ ہوتی ہے۔ اس سے ذوق جمال آسودہ ہوتا ہے، حالات کی نزاکت نے اہل دین کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ ایسے ادب کے وکیل بن جائیں جو صالح ہو حیا سوز نہ ہو، اسلام پسند ہو خدا بیزار نہ ہو، وہ اصلاح کا ذریعہ ہو فساد کا آلہ کار نہ ہو، اس اہم کام کے لئے تحریکیں اٹھی ہیں برصغیر میں ادارہ ادب اسلامی کے نام سے تحریک اٹھی اس کی ایک تاریخ ہے۔ ''پیش رفت'' کے نام سے اس کا ایک ادبی ترجمان شائع ہوتا ہے۔ بہت سی ادبی شخصیتیں اس سے وابستہ رہی ہیں، عالمی اور بین الاقوامی سطح پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے رابطہ ادب اسلامی قائم کیا، دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں جو سرگرم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں تعمیر و تخریب، خوب و ناخوب دونوں ایک دوسرے سے ستیزہ کار رہتے ہیں اس لئے ادب اس سنگھرش میں تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا ہے، ادیب اور فنکار جو کچھ بھی سپرد قرطاس کرے گا اس کی عمر ادیب اور فنکار کی عمر سے زائد ہوگی۔ اس کے اثرات صرف حال پر نہیں بلکہ مستقبل پر بھی پڑیں گے۔ حال اور مستقبل کے ناقد کو یہ جائزہ لینے کا حق ہے کہ ادیب نے اس کشمکش اور سنگھرش میں حق کا ساتھ دیا تھا یا باطل کا، خیر اور حسن کی حمایت کی تھی یا شر اور بدی کی۔

اب آخری بات ادب اسلامی کی اصطلاح کے بارے میں۔ اسلامی ادب کی اصطلاح زیادہ قدیم نہیں۔ دراصل عہد حاضر میں ادب کو مختلف نظریات سے منسوب کیا جانے لگا، رومانی ادب، ترقی پسند ادب، وجودی ادب، ادب لطیف، اشتراکی ادب اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحیں مقبول خاص و عام ہوگئیں، اہل ادب نے اپنے اپنے اسٹیج سے اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا، دراصل حیات انسانی کی کاوشیں کسی نہ کسی تصور اور عقیدہ پر منحصر ہیں، یہ عقیدہ و اذعان ہے جو کاروان حیات کو سرگرم سفر رکھتا ہے، حیات و کائنات کے بارے میں نظریہ اگر درست ہوگا تو اس کا اثر لازمی طور پر ادبی کاوش اور تخلیق

> ایک اسلامی ادیب کا کام فن کی شرطیں پوری کرنا ہوتا ہے خواہ موضوع کچھ بھی ہو، وہ ناول اور افسانہ بھی لکھے گا تو اس کا کام نظریاتی قبلہ کو درست کرنا ہوگا لیکن زاہد خشک اور محتسب بن کر نہیں وہ اپنی بات کو فن کے لباس حریر میں پیش کرے گا اس میں اسے استاد کا کم اور خیر خواہ دوست کا رول زیادہ ادا کرنا ہوگا۔

پر بھی پڑے گا، مختلف نظریات حیات اور نظام ہائے حیات کے درمیان اس کی ضرورت پیش آ گئی کہ ادب اسلامی کی بھی اپنی شناخت ہو، اسلامی ادب اگر چہ موج تہ آب کی مانند ہمیشہ سے ہے لیکن نظریات اور اصطلاحات کے اس عہد میں اسلامی ادب کی اصطلاح وضع کرنے کی ضرورت پیش آئی اور ایک باضابطہ مکتب فکر کی حیثیت سے اس کا وجود عمل میں آیا، اگر انگریزی ادب اور فرانسیسی ادب کی ترکیبیں لوگوں کے لئے نامانوس نہیں ہیں، اگر اسلامی فن تعمیر اور اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کے ناموں میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی ہے تو ہمیں اسلامی ادب کی اصطلاح کو بھی گوارا کرنا چاہئے، دور جدید واضح طور پر نظریاتی قطبیت کا دور ہے، اس فضا میں اسلام کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے اگر اس پر اصرار کریں کہ وہ اسلام کے معیار پر ادب کے اصول متعین کریں گے اور تنقید کے لئے اس کو پیمانہ بنائیں گے تو آخر کس دلیل سے اسے غلط قرار دیا جاسکتا ہے؟ جو لوگ اسلامی نظریہ حیات کو نہیں مانتے ان سے ہم اصرار نہیں کرتے کہ وہ ہمارے نظریہ کو قبول کریں لیکن یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ انصاف کو اپنا شعار بنائیں اور گلاب کے پھول کی خوبصورتی کی تعریف کریں، یہ گلاب کا پھول جس طرح مئے خانہ کے دروازہ پر کھل سکتا ہے اسی طرح وہ مسجد کے صحن میں بھی اپنی بہار دکھا سکتا ہے، یہ نا انصافی ہے کہ مئے خانہ میں کھلے تو پھول کہلائے اور مسجد میں کھلے تو ببول کہلائے۔
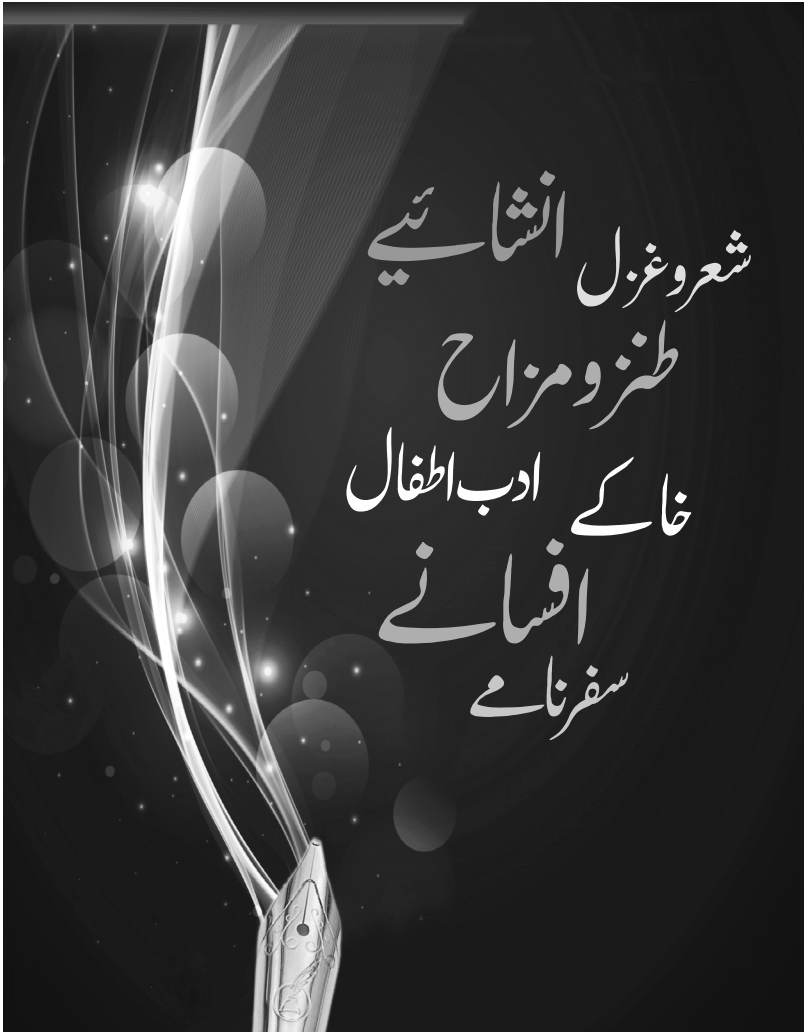
قارئین اپنے سوالات بذریعہ ای میل یا وہاٹس ایپ (اس نمبر پر 9673022736) بھیج سکتے ہیں۔

سوال: میں ایک ایس آئی او کا ممبر ہوں اور پیشہ سے ایک انجینئیر ہوں۔ ان دنوں ایک معاملہ میں کنفیوزن کا شکار ہوں لہٰذا آپ سے اس معاملہ میں رہنمائی درکار ہے۔ معاملہ یوں ہے کہ میں ایک لڑکی کو بہت پسند کرتا ہوں اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ اس بات کا علم گھر کے سارے لوگوں کو ہے لیکن ہماری شادی پر وہ ہرگز راضی نہیں ہیں۔ لڑکی اخلاق ومزاج کے اعتبار سے بہت اچھی ہے اور اس بات کی گواہی ہماری امی خود دیتی ہیں۔ لیکن اپنے حالات کی مجبوریوں کے سبب تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اسے نہ کچھ پڑھنے آتا ہے اور نہ کچھ لکھنے۔ علاوہ ازیں ہمارے اور ان کے کلچر میں کافی فرق ہے۔ لڑکی کی والدہ کا تعلق عراق سے ہے۔ گھر میں عربی گفتگو کا چلن ہے۔ بڑے بھائی عیسائی ہے اور دوسرے بھائی ہے مگر وہ بھی تھوڑے سے آوارہ مزاج کے۔ گویا ان تمام چیزوں کو لے کر ہماری امی کا کہنا ہے کہ ہم دونوں میں بالکل بھی جوڑ نہیں۔ جس سے ہوسکتا ہے کہ اس اندھی محبت میں ہم دونوں کی زندگی خراب ہوجائے۔ اب چونکہ شادی کا فیصلہ زندگی کا ایک اہم موڑ ہوتا ہے لہٰذا اس مسئلہ میں آپ رہنمائی فرمائیں کہ کیا لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا اور دونوں خاندانوں کے کلچر میں ہم آہنگی ہونا کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے ضروری ہے؟ (ایک قاری)

جواب: آپ نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں اس کے علی الرغم میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ کسی انفرادی نوعیت کے معاملہ پر دور سے بیٹھے بیٹھے میں کوئی قابل عمل جواب دے سکوں۔ اور فی الحقیقت میں کسی ایسے معاملے کا جواب دینا چاہتا بھی نہیں ہوں۔ شادی بیاہ کے معاملات میں اونچ نیچ کا ہونا ممکن ہے۔ آپ لاکھ چھان پٹک کر بھی رشتے جوڑیں تب بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ زوجین کی ازدواجی زندگی کامیاب ہی گذرے گی۔ اس سوال کے حوالے سے درج ذیل اصولی باتیں پیش کردیتا ہوں، جس سے نہ صرف آپ کو بلکہ ہر رشتہ ڈھونڈنے والے کو خود کے لئے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوسکے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

1) اللہ کے رسولؐ نے دین داری کو نسب، مال اور خوبصورتی سے زیادہ فوقیت دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین داری کی بنیاد پر طے کئے جانے والے رشتوں پر اللہ کی خصوصی رحمت ہوتی ہے۔ انسانوں کے درمیان معاملات طئے کرتے وقت ہمیں خدا کی اس روشنی سے فیض حاصل کرنے کی بھرپوری کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ہماری نظر ظاہری عوامل جیسے کہ نسب، مال اور خوبصورتی پر ہو تو اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ ہم خداترسی کے معیارات پر کمتر ثابت ہوجائیں۔ ہر لحظہ اس جانب کوشاں رہنا چاہئے کہ چاہے ان ظاہری عوامل اور معیارات حاصل نہ ہوں لیکن اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر رشتے طئے کئے جائیں۔

2) اپنی پسند کی شادیوں میں بالعموم اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہوائے نفس، خداترسی پر غالب ہوجائے۔ ایسی شادیوں سے قبل ہونے والی بے تکلفی بہت سے ضروری حجابات کو ختم کردیتی ہے۔

3) آج کل تعلیم کو بھی ایک معیار قرار دیا جاچکا ہے۔ اور اس کی بنیاد پر شادی بیاہ کے معاملات طئے کئے جاتے ہیں۔ اس کا بنیادی جوہر معیارِ زندگی کا حصول اور مال کو جمع کرنے کے مواقع سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے تعلیم کا یہ مطلب دین داری کے معیارات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی طرح ڈگریوں کا جمع ہونا کسی کے مہذب ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کسی لڑکے یا لڑکی کا فارمل ایجوکیشن کے تحت تعلیم حاصل کرنا اس کے کردار واخلاق کے لئے ضروری امر قرار دینا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

4) زوجین کے مابین مختلف کلچرس اور زبانوں کا ہونا ایک مشکل پیدا کرسکتا ہے۔ لیکن شریعت نے اسے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی ہے۔ یہ غالباً اس لئے ہے کہ انسانوں کو اللہ نے ایک سے زائد زبانیں سیکھنے کی استعداد بخشی ہے۔ کچھ وقت تک شاید مدعا واضح کرنے میں دشواری ہو، لیکن پھر تہذیبوں اور زبانوں کا تفاوت فی الواقع بڑا رومینٹک ثابت ہوتا ہے۔ ہم مالابار کے علاقوں میں عربوں کی شادیوں کی داستانیں سنتے ہیں۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زوجین میں سے ایک نے ضرور دوسرے کی زبان کو سیکھا ہوگا۔ تب ہی جاکر وہ ایک نئی نسل کی ایجاد کرسکے۔ اگر زبانوں کا علم نہ بھی ہو تو "زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم" کا مزہ لینے میں کیا حرج ہے۔

5) انسانوں کی شناخت کرنا ایک مشکل کام ہے۔ کچھ افراد اپنے خاندان کا پرتو ہوتے ہیں۔ اور اس وجہ سے ان کی عادتیں اور مزاج کا اندازہ ان کے خاندان کے افراد سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ آج کے انفرادیت کی خواہش رکھنے والے معاشرے میں ہر فرد اپنے خاندان سے آزاد اپنی ایک شناخت بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے کسی کو اس کے خاندان کی بنیاد پر اچھا یا برا قرار دینا مناسب نہیں ہے۔ اگر کوئی فرد اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے خاندان کی بدنامی وبدعملی سماج میں اس کو اچھا مقام دلانے میں مانع ثابت نہیں ہونی چاہئے۔ یہی بات رشتوں کا انتخاب کرتے وقت بھی ذہن میں رہنی چاہئے۔

6) شادی کوئی "جنم جنم کا ساتھ ہے ساتھیا" والا کوئی رومانی اور نامعقول ادارہ نہیں ہے۔ شریعت نے اسے انسانوں کی افتادِ طبع کے اعتبار سے بہت ہی معقول بناکر پیش کیا ہے۔ اس لئے شادی میں کوئی سو فیصد گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ اگر نباہ نہ ہوسکے تو پوری شرافت اور عزت سے زوجین اپنی اپنی جگہ واپس آسکتے ہیں۔ اس لئے یہ سوچ کر شادی کرنا کہ کچھ بھی ہوجائے صرف اسی ایک شخص کے ساتھ ساری زندگی بِتانی ہے، بالی ووڈ کی فلموں ہی کی حد تک رکھنا مناسب ہے۔ اس لئے اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ناتفاقی ہوجائے جس کا مداوا کسی بھی حال میں ممکن نہ ہو تو ہنسی خوشی شریعت کی سہولتوں پر عمل کرتے ہوئے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ شادی ایک معاہدہ یا اگریمنٹ ہے۔ اگر فریقین اس معاہدہ کو پورا نہ کرسکتے ہوں تو ان کے یہاں اس معاہدے سے آزاد ہونے کے طور طریقے موجود ہیں۔

7) لوگ بڑی آسانی کے ساتھ سارے معاملات شادی سے قبل طئے کرلینا چاہتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ انسانوں کے مزاج کو سمجھنا، ان کو اپنی زندگی میں جگہ دینا، ان کی ذمہ داریوں کو قبول کرنا، جنسی مطابقت رکھنا، یکساں تہذیب اور سماجی معاہدوں کو ترتیب دینا تو ظاہر ہے اسی وقت ممکن ہے جب لوگ ساتھ میں رہیں، زندگی گذاریں، خوشی اور غم، آسودگی اور فراغت کے مراحل میں ایک دوسرے کو سمجھیں تب ہی ہم فریق مخالف کو اچھی طرح جانچ سکتے ہیں۔

اس رویہ کے برخلاف ہونا یہ چاہئے کہ فریقین نکاح کے بعد اپنے معاملات کو درست رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ شریعت کی سختی سے پابندی کریں، محبت اور دلسوزی کا رویہ اختیار کریں، باوقار ایڈجسٹمنٹ کریں تو ہر شخص پورے اطمینان کے ساتھ ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گذار سکتا ہے۔ گویا شادی سے قبل نہیں اس بات کی پیش بندی کہ آئندہ کوئی مسئلہ کبھی کھڑا ہی نہ ہو ایک غیر معقول اور بے نتیجہ عمل ہے۔ جبکہ اللہ کے رسولؐ کے معیارات کے مطابق شادی کرکے اس کے بعد ہر روز کے معاملات خداترسی کا رویہ اختیار کرنے کی پلاننگ انسانوں کو کرنی چاہئے۔

تخلیقیت (Creativity)

کہتے ہیں تخیل، انسانی زندگی کا ایک ناگزیر جز ہے۔ دنیا کے سبھی انسانوں میں تخیلاتی صلاحیت ہوتی ہے، کسی میں کم تو کسی میں زیادہ ۔ چاہے آپ Van Gogh کی پنٹنگس دیکھیں یا پھر آئنسٹائن کا پیش کردہ نظریہ، آپ کو یہ ماننا پڑے گاکہ یہ دونوں ہی تخیل اورتخلیقیت ((Imagination and Creativity کی عمدہ مثالیں ہیں۔ تخیل وہ جذبہ ہے جو ہمیں اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلاتا ہے، اور ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ دنیا کو اس کی وسعتوں کے ساتھ ہم پر آشکار کرتا ہے اور پھر ان وسعتوں کی حدود سے آگے بڑھ کر ہمیں، نئے خیالات، ایجادات اور دریافتوں یعنی تخلیقیت کے درجہ تک لے جاتا ہے۔ البتہ ایک اہم سوال یہ ہے کہ ہم اپنے اس تخیل کی صلاحیت کو استعمال کیسے کریں؟ اور تخلیقیت کے درجہ تک کیسے پہنچائیں؟ اس سوال کے جواب میں سائنس ہمیں تخیل کی تین قسمیں بتاتی ہے۔

۱) تخلیقی تخیل: (Creative Imagination)

اس سے مراد اپنے ذہنی تصورات کے ذریعے سے کسی تخلیقی مرحلے تک پہونچنا ہے۔ مثلاً عام گھریلو مسائل کو نت نئے اور موثر طریقوں سے حل کرنے کی کوشش، یااپنی ذہنی اپج کوکوئی مفید تخلیق کی شکل دینا۔ تخلیقی تخیل کی صلاحیت ہر شخص میں، کسی نہ کسی درجہ میں ہوتی ہے۔ اور تحقیق کے مطابق سازگار ماحول اسے پروان چڑھانے کے لئے انتہائی اہم ہوتا ہے۔ تو جدت و ندرت کی اس فضا کو ہم جتنا پروان چڑھائیں گے، اتنا ہی افراد میں تخلیقی رجحان بڑھے گا۔ اس تخلیقی تخیل کے دو مراحل ہیں۔

(۱الف)اختلافی سوچ (:(Diversion Thinking یہ پہلا مرحلہ ہے، جہاں کسی مسئلہ یا موضوع پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے آزادانہ طور پر سوچنے کی ضرورت ہے۔ ان میں فوری اور فطری، وجدانی تصورات ہو سکتے ہیں۔

(ب) مرکوز سوچ (:(Conversion Thinking اس مرحلے میں اب اسی مسئلہ یا موضوع کے تحت اپنی سوچ کو مرکوز کرتے ہوئے کسی ایک نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس میں تصورات تجزیاتی، سست اور دانستہ نوعیت کے ہوں گے۔

لیکن یاد رکھیں، اس کے باوجود بھی یہ ضروری نہیں کہ آپ اپنے تخیلات کی بنیاد پر مناسب اورتخلیقی نتائج حاصل کر لیں۔ تحقیق کے مطابق تخلیقیت کے حصول میں، تجربہ بھی اہم رول ادا کرتا ہے۔ اپنے تخیلات کی سمت میں جتنا زیادہ آپ کا سابقہ متعلقہ افراد اور اشیاء سے ہوتا رہے گا، اور اپنی غلطیوں سے مستقل سیکھنے کی جتنی سکت آپ میں پیدا ہوگی، اتنا ہی آپ کے تصورات میں پختگی اور تخیل میں راستی پیدا ہوگی، اوربالآخر تخلیقیت کا ظہور بھی ہو گا۔

اگرآپ نے فلم ''تھری ایڈیٹس'' دیکھی ہے، تواس فلم کامرکزی کردار ''پھنسک وانگڑو'' جس شخصیت سے متاثرہوکرلکھاگیاہےوہ ہیں ''سونم وانگچک''۔ یہی وہ شخص ہے، جس نے بھارت میں تعلیم کے طریقہ کارپر نہ صرف بہت سارے سوالات اٹھائے ہیں، بلکہ ان کا عملی حل بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔

1966ءمیں لیہہ کے ایک چھوٹے سے گاوں میں پیداہوئےاور گاوں میں اسکول نہ ہونے کے باعث، 9سال کی عمرتک گھرمیں اپنی مادری زبان میں اپنی ماں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 9 سال کی عمرمیں ان کے والد کی سری نگر منتقلی کے سبب، یہ خاندان سری نگر آیا، اور وانگچک کو آگے کی تعلیم کے لئےایک اسکول میں داخل کیاگیا۔ خود وانگچک کی زبانی، اسکول کا یہ ایک سال ان کی زندگی کا ''تاریک ترین عرصہ'' ہے، کیونکہ سری نگر کے اس اسکول میں جس زبان میں تعلیم کا نظم تھا، وانگچک اس سے پوری طرح نابلد تھے، جس کی بنیادپرانہیں ایک بدھو طالب علم سمجھ کر نظرانداز کیاجاتاتھا۔ اس صورتحال سے دلبرداشتہ وانگچک، تنہابھاگ کر دہلی آئے اور ایک ادارے کے پرنسپل سے ملاقات کر، اپناحال سنایا، اوران کی مدد سے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

اپنے اخراجات خود پورے کرتے ہوئے، معروف ادارے این، آئی، ٹی سری نگر سے 1987 میں میکانکل انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کی اوراپنے چند ساتھیوں کے ساتھ SECMOL (Students'Educational and Cultural Movement of Ladakh) کی بنیادڈالی، جس کا مقصد لداخ میں سرکار کے اسکولی نظام میں اصلاحات کا تھا۔

1994ءمیں وہ Operation New Hope کے دست و بازو بنے، جس میں بلدیہ اور عوام کوشامل کرکے دیہاتی سطح پرنظام تعلیم میں اصلاحات کی گئیں۔ اعداد وشمار کے مطابق اس آپریشن کے باعث دیہاتوں میں میٹرک کی تعلیم میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبا کا

۲) ماورائی تخیل: (Fantastical Imagination)

کچھ لوگوں کا انداز تخیل، نرالا اور ماورائی ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک انوکھے (Hypothetical)خیال کو مکمل طور پر جذب کر کے ایک کامیاب اور تخلیقی پراجکٹ تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہاں قوی امکان ہے کہ انسان دن میں خواب دیکھنے کا عادی ہو جائے اور عملی دنیا سے دور ہوتا چلا جائے۔ اس لئے ابتدائی صورت میں اس کو قبول کر لینا مناسب نہیں۔ لیکن وہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ماورائی تخیل بچوں میں تخیلاتی صلاحیت، قوت بیان، زاویہ نگاہ اور بڑوں میں قوت حافظہ کی مضبوطی، منصوبہ بندی اور مسائل و مشکلات کے تخلیقی حل تلاش کرنے جیسی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے۔

۳) حقیقی تخیل :(Episodic Imagination)

جب ہم اپنے ذہن کی آنکھوں سے کچھ چیزیں ترتیب دے رہے ہوتے ہیں حقیقی تخیل، محض خیالی دلائل کے بجائے حقیقی دلائل کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں عملی نتائج تک پہونچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ماضی کی غلطیوں اور ناکامیوں سے سبق حاصل کرکے اچھا مستقبل بنانے میں حقیق تخیل انتہائی کارآمد ہے۔ یہاں یہ بات جان لینابھی ضروری ہے کہ مستقبل کی بہتر منصوبہ بندی میں نتائج کے بالمقابل طریقہ کار پر زیادہ توجہ رکھنا، کامیابی کے امکان بڑھا دیتا ہے، جو حقیقی تخیل کا سبق ہے۔

یا د رکھیں، آئنسٹائن نے کہا تھا ”ذہانت کا حقیقی مظہر علم نہیں، تخیل ہوتا ہے۔“

بشکریہ: ورلڈ اکنامک فورم

خاص شخصیت

فیصد آجکل 75 ہے، جواس سے قبل 5 فیصد تھا۔اسی کی ایک اور عملی شکل لیہہ کے قریب واقع SECMOL کا کیمپس ہے، جوامتحان میں ناکام ہونے والے طلبا کے لئے ایک متبادل کیمپس ہے، جہاں سے وہ کامیاب تاجر، فلم ساز، سیاست داں، استاد وغیرہ بن کر نکلتے ہیں، جس کی ایک جھلک آپ تھری ایڈیٹس فلم میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وانگچک بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسال فرانس بھی گئے، اور 2011 میں وہاں سے Earthern Architecture کی تعلیم مکمل کی۔ان کی سائنسی ایجادات کادائرہ، بیشتر اطراف کے گاوں کی ضرورتوں پر محیط ہے۔ جس کی ایک مثال ”برفانی استوپا“ Ice Stupa ہے۔یہ بڑے برفانی گنبد، سردیوں میں ضائع ہونے والے چشموں کے پانی کو محفوظ رکھتے ہیں، جنہیں اپریل اور مئی کے مہینوں میں، جبکہ پانی کی قلت ہوتی ہے، فصلوں کی آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس تکنیک سے سوئٹزرلینڈ کے کئی دیہاتوں نے بھی وانگچک کی رہنمائی میں استفادہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی خدمات میں مٹی کی دیواروں سے کم خرچ میں ایسے گھر بنانے کی تکنیک بھی ہے، جو باہر کے منفی درجہ حرارت کے باوجود اندرونی ماحول کو گرم رکھ سکیں۔ متعدد قومی وعالمی اعزازات پانے والے وانگچک، جموں و کشمیر کی اسکولی تعلیم کے ریاستی بورڈ کے رکن بھی رہے، نیز کئی حکومتی سطح کے منصوبہ سازاداروں کا حصہ رہے۔

ابو رجاء

ایس آئی او کا حکومت سے ایم این اے ایف فیلوشپ کو روکنے کی نئی نوٹیفیکیشن منسوخ کرنے کا مطالبہ

حال ہی میں جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق ملک کے مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں داخلہ کا تناسب دوسری قوموں سے کم ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ایک آل انڈیا سروے کے مطابق سن ۲۰۱۶-۱۷ء میں مسلم طلبہ کے داخلہ کا تناسب صرف چار اعشاریہ نو فیصد تھا۔ ملک کی کل آبادی میں اپنی چودہ فیصد آبادی کے تناسب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔ صرف طلبہ کے درمیان ہی نہیں بلکہ اساتذہ کے درمیان بھی مسلمانوں کی نمائندگی کافی کم ہے۔ پورے ملک کے صرف چار اعشاریہ نو فیصد اساتذہ ہی مسلم قوم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایس آئی او کے قومی صدر جناب نحاس مالا نے کہا کہ ''ایسی بدتر صورتحال میں حکومت کی یہ منصفانہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس نمائندگی کو یقینی بنا کر یہ خلا پر کرے۔ اس صورتحال کے باوجود مرکزی حکومت مسلم طلبہ کو دی جانے والی ایم این اے ایف فیلوشپ میں کئی دیگر شرائط لگا کر اسے اور زیادہ مشکل بنا رہی ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی نمائندگی اور کم ہو جائے گی۔ حکومت کی جانب سے جاری نوٹیفیکیشن کے مطابق اب مسلم طلبہ کو اس فیلوشپ کے لئے نیٹ کا امتحان پاس کرنا ضروری ہوگا۔ یہ اور کچھ نہیں بلکہ حکومت ہند کی جانب سے مسلمانوں کی حصہ داری اور ان کی نمائندگی کو کمزور بنانے کا ایک اور ہتھکنڈہ ہے۔

ایس آئی او کا مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فیس بڑھوتری کے فیصلے کو واپس لینے کا مطالبہ

ایس آئی او حکومت ہند سے اس نئی نوٹیفیکیشن کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ درخواست کرتی ہے کہ مسلم طلبہ کو یہ فیلوشپ جیسے پہلے دی جارہی تھی اسے جاری رکھا جائے۔ اس کے علاوہ ایس آئی او حکومت ہند سے یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں کمزور طبقوں سے آنے والے طلبہ کی نمائندگی کو مضبوط اور یقینی بنایا جائے جیسا کہ حکومت کے شعبہ انسانی وسائل و ترقی نے اے آئی ایس ایچ ای 2017 میں کہا ہے۔

ایس آئی او آف انڈیا کے قومی صدر جناب نحاس مالا نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں ڈپلوما، یو جی پی جی اور ریسرچ کورسز اور دیگر متفرق فیسوں میں یونیورسٹی کی انتظامیہ کی جانب سے کی گئی بڑھوتری کے فیصلے کو واپس لینے کا مطالبہ کیا، جو اقتصادی طور پر پسماندہ طلبہ برادری پر اثر ڈالے گا۔ جیسا کہ یونیورسٹی اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جانی جاتی ہے، جس میں طلبہ کی اکثریت معاشی طور پر کمزور طبقوں سے آتی ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو غیر معمولی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ حالانکہ پچھلے سال بھی فیس میں بڑھوتری ہی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فیس میں بڑھوتری مسلسل جاری ہے۔

انہوں نے کہا کہ اقتصادی طور پر پسماندہ طبقوں سے آنے والے طلبہ کو نظر میں رکھتے ہوئے یونیورسٹی انتظامیہ کو طلبہ اور طلبہ یونین کے مطالبات کو سننا چاہیے جس کا احتجاج اب بھوک ہڑتال میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ گزشتہ سالوں میں طلبہ کے حق میں فیصلے لیتی رہی ہے اور ہم اس بار بھی امید کرتے ہیں کہ وہ طلبہ کو مایوس نہیں کرے گی۔ ہم ان سے سوشل سائنس فیکلٹی اور شعبہ لسانیات میں لیبارٹری کی مانگ بھی کرتے ہیں جس کے لیے فیس بھی لی گئی ہے۔